تعمیر حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میں اپنے اس اندرونی یقین اور اس بدیہی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دوں، کہ کسی ملک اور دور میں بھی تعلیمی و تعمیری کام کے لیے (خواہ وہ کتنے مقدس، ضروری اور مفید ہوں) شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل (NORMAL) حالات ہوں، جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی قہرسامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو، وہاں تعلیمی و تعمیری کام کے لیے دماغی سکون، اور ولولۂ عمل کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے، یہ تو غیر اختیاری امور ہیں اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں، لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں، اور اچھے پڑھے لکھے انسانوں پر اعصابی (ہسٹریائی) دورے جلد جلد پڑتے ہوں، جہاں دولت و قوت کے سوا کوئی حقیقت زندہ اور مسلّم نہ مانی جاتی ہو، اور جیسا کہ میں نے ابھی سیوان کی تقریر میں کہا تھا کہ،

"یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں یا عمارت پر بجلی گر جائے۔ نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، کسی مجمع پر چھت یا دیوار گر جائے، کوئی ہاتھی یا سانڈ مست ہو کر انسانوں کی جان لے لے، اس لیے کہ یہ سب بے شعور و بے ضمیر چیزیں ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی کسی پڑھے لکھے آدمی پر گر جائے، جیسا کہ جمشید پور، راوڑکیلا اور رانچی میں ہوا (یا اب علیگڑھ میں ہو رہا ہے) ایک ہی کالج میں پڑھانے والا استاد دوسرے استاد کے خون میں ہاتھ رنگ لے، طالب علم طالب علم کی مخبری کرے، اور کسی سیاسی جماعت کا ایک رفیق دوسرے رفیق کا گلا کاٹے۔"

اور جہاں یہ دورے کسی وقت بھی معاشرہ پر پڑ سکتے ہیں، اور لوگ معمولی بات پر اپنا دماغی توازن کھو سکتے ہیں، وہاں کسی تعلیمی و تعمیری کام یا ادارے کے بقا کی ضمانت کب تک دی جا سکتی ہے اور اس غیر یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے ہو سکتا ہے؟ بقول میر ؏

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس فضا میں ادب و شاعری اور فنون لطیفہ اور اقبالؒ کے الفاظ میں "لذت کردار اور جرأت اندیشہ" کی بھی کیا گنجائش ہے؟

یہ تو ملک گیر اور وسیع پیمانہ کے حوادث ہیں، جہاں سوسائٹی اتنی مسخ (CORRUPT) ہو جائے کہ کسی کو بغیر رشوت دیے نہ اس کا حق ملے، نہ ریل پر وہ آرام کر سکے، نہ طالب علم پڑھنے کی طرف متوجہ ہوں نہ استاد پڑھانے کی طرف، انتظامیہ کے سب کام بے عمل اور سست ہوں، پورے ملک میں وقت کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، سفر غیر محفوظ، اور قیام مخدوش ہو جائے، وہاں اس بگڑتے ہوئے معاشرہ میں افراد کے لیے اپنے اصولوں پر قائم رہنا کب تک ممکن ہے؟

اس بنا پر میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہو سکتی ہے اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی۔ اس لیے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ہر دعوت و تحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے، کم سے کم اس کی حیثیت وہ ہے جو کسی فراش یا سقہ، یا زمین برابر کرنے والے یا شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے، جس کے بعد کوئی بھی جلسہ، یا اجتماع ہو سکتا ہے۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

Regd No. LW/NP 56

Phone: 42948 49747

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

مزید مسائل کے لیے ۲۵ اکتوبر کا شمارہ دیکھیے

کسی پر قربانی واجب تھی لیکن قربانی کے تین دن گزر گئے اور اس نے قربانی نہیں کی تو ایک بکری یا بھیڑ کی قیمت خیرات کر دیوے۔ اور اگر بکری خرید لی تھی تو وہی بکری بعینہ خیرات کر دے۔

قربانی کی کھال یا تو یونہی خیرات کر دے یا بیچ کر اس کی قیمت خیرات کر دے وہ قیمت ایسے لوگوں کو دے جنکو زکوٰۃ کا پیسہ دینا درست ہے اور قیمت میں جو پیسے ملے ہیں بعینہ وہی پیسے خیرات کرنا چاہیے۔ اگر وہ پیسے کسی کام میں خرچ کر ڈالے اور اتنے ہی پیسے اپنے پاس سے دے دیے تو بری بات ہے مگر ادا ہو جائیں گے۔

اس کھال کی قیمت کو مسجد کی مرمت یا اور کسی نیک کام میں لگانا درست نہیں، خیرات ہی کرنا چاہیے۔

قربانی کی کھال کی قیمت سے مدرسہ کی عمارت بنانا یا مدرسین کی تنخواہ دینا بھی درست نہیں ہے۔ کسی میت کی تجہیز و تکفین میں صرف کرنا بھی درست نہیں ہے قربانی کی کھال قصاب کو اجرت میں دینا بھی درست نہیں ہے۔

اگر کھال کو اپنے کام میں لاوے جیسے اس کی چھلنی بنوالی یا مشک یا ڈول یا جانماز بنوالی یہ بھی درست ہے۔

سیرت

مولانا سید محمد علی مونگیری

بانی ندوۃ العلماء

از مولانا سید محمد الحسنی (مدیر البعث الاسلامی)

مولانا سید محمد علی مونگیری بانی و ناظم ندوۃ العلماء کی سیرت ندوۃ العلماء پر ایک قرض تھا۔ ان کی شخصیت اور ان کی خدمات اس کی مستحق تھیں کہ ان کو نہ صرف ندوۃ العلماء کی تاریخ میں بلکہ ہندوستان کی اصلاحی اور دعوتی تاریخ میں بھی نمایاں جگہ دی جائے اور اس کا شایان شان تعارف کرایا جائے۔

پیش نظر کتاب میں مولانا کی شخصیت کے پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا مقدمہ ہے۔

—— قیمت ——

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء۔ پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی کی مفصل رُوداد

مرتبہ: مولانا محمد الحسنی ندوی

مدیر البعث الاسلامی (دار العلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ)

○ ایک دستاویز —— ○ ایک کہانی —— ○ ایک پیغام

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی (منعقدہ نومبر ۱۹۷۵ء) کی تفصیلی رپورٹ جس کا آپ کو شدت سے انتظار تھا منظر عام پر آگئی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کے ایماء پر یہ روداد مرتب کی گئی ہے، جس میں شیخ الازہر کا خطبۂ صدارت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تاریخی خطبۂ استقبالیہ اور اجلاس کی دوسری تقریریں، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے قلم سے ندوۃ العلماء کے ماضی، حال اور مستقبل کا خاکہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے صبح کے وقت کیے ہوئے ایمان افروز بیانات، اہم تقریروں اور مقالات کے خلاصے سب شامل ہیں۔

اس کے علاوہ اجلاس کے وسیع انتظامات و تیاریوں اور اجلاس کے مناظر کی اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے پڑھنے والا خود اجلاس میں شریک ہے اور تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

پوری کتاب دار العلوم کی خوبصورت عمارتوں کی تصاویر نیز دوران اجلاس نماز جمعہ کے دلفریب منظر سے بھی مزین ہے۔

○ خوبصورت رنگین ڈسٹ کور —— ○ دیدہ زیب گٹ اپ

ضخامت: ۳۰۰ صفحات (علاوہ تصاویر) قیمت: مجلد صرف ۱۵ روپے

ملنے کے پتے: ① مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء۔ پوسٹ بکس ۹۳۔ لکھنؤ
② کتب خانہ رشیدیہ۔ جامع مسجد۔ اردو بازار۔ دہلی

ایک نیا سنگ بنیاد رکھیے!

ماء اللحم خاص

قبل از وقت بوڑھوں اور غیر صحت مند نوجوانوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ تازہ پھلوں قیمتی دواؤں اور بہترین غذاؤں سے جدید طریقہ پر تیار کیا جاتا ہے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد الحسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

تعمیر حیات میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجیے

لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۱۶ | ۲۵ر نومبر و ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۸ء — ۲۳ر ذی الحجہ و ۹ر محرم الحرام ۱۳۹۸ھ | شمارہ ۲ و ۳

چندہ سالانہ

اندرون ملک: بارہ روپے

بیرون ملک: بحری ڈاک جملہ ممالک ڈھائی پونڈ

ہوائی ڈاک

بیرون ملک: مشرق وسطی، سعودی عربیہ، ایران وغیرہ پاکستان، برما و لنکا سے چار پونڈ

بیرون ملک: ممالک افریقہ سے ساڑھے پانچ پونڈ

بیرون ملک: ممالک یورپ سے سات پونڈ

اس دائرہ میں اگر سُرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ بارہ روپے ارسال فرمائیے، اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو دی۔پی ہی سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع دی۔پی خرچ 15/25 Rs. کے مطالبہ کی دی۔پی سے روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

اسحٰق جلیس ندوی

فسادات کی لہر — شمال سے جنوب تک

مسلمانوں کے دینی، سیاسی، سماجی رہنماؤں کے لیے لمحۂ فکریہ

اس ملک کے ہر ذی شعور انسان کے ذہن میں ایک سوالیہ نشان ہے کہ "کیا فسادات اس ملک کا مقدر بن چکے ہیں"؟ اس کا تدارک اور سدّباب ممکن نہیں۔؟ کل تک ہم یہ کہہ کر اپنے دل و دماغ کو تسلی دیا کرتے تھے کہ بدیسی طاقت اپنے اقتدار کی مدت دراز کرنے کے لیے اس ملک کی مختلف اکائیوں کو لڑاتی ہے۔ لیکن انگریزی سامراج کے انخلاء، باہمی اتفاق سے ملک کو دو ڈومینین کی شکل میں تسلیم کرنے، اس ملک میں سیکولر نظام حکومت کا فیصلہ کرنے، اور ایک ایسی جمہوریہ کے قیام کے بعد جس میں تمام مذہبی، تہذیبی، لسانی اقلیتوں کو مساوی حقوق، جان و مال، عزت و آبرو، مذہب و تہذیب، زبان اور کلچر کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، آئے دن فرقہ وارانہ فسادات اور اقلیتوں میں عدم تحفّظ کا احساس پیدا کرنے کا سلسلہ کیوں جاری ہے۔ اس انسانیت کُش اور تشویشناک عمل نے اب ان علاقوں کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا ہے جہاں کے باشندے کسی بھی جنونی دور میں بربریت کا شکار نہیں ہوئے۔

۱۹۴۷ء اور اس کے بعد شمالی ہند، وسط ہند میں وہ سب کچھ ہوا، ہوتا رہا اور آج تک ہوتا ہے، جس سے انسانیت کا سر شرم سے جُھک جائے اور حق و انصاف سر پیٹ کر رہ جائیں۔ لیکن جنوب کے تامل ناڈ اور کیرالا جیسی ریاستیں ہمیشہ اس وبا سے محفوظ رہیں۔ لیکن امسال تامل ناڈ کے پرنام بٹ اور چند دیگر مقامات پر فرقہ وارانہ منافرت نے جو بھیانک اور تکلیف دہ صورت اختیار کی وہ ہم سب کے لیے بڑی تشویشناک بات ہے۔ ہندوستانی سماج میں پیدا شدہ اس مہلک رجحان کی اصلاح کی طرف اگر اب بھی سنجیدگی، فکرمندی، منصوبہ بندی اور باہمی مشورہ سے کوئی لائحہ عمل طے نہیں کیا گیا تو اس کے اثرات بد سے نہ صرف اس ملک کی اقلیتیں متاثر ہوں گی بلکہ پورے ملک کا مستقبل، تعمیر و ترقی کے منصوبے، بین الاقوامی سطح پر اس ملک کا وقار اور دنیا کے ممالک سے خوشگوار تعلقات خطرے میں پڑ جائیں گے۔

اس سلسلے میں مسلمان زعماء کو ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔ مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد راوڑکیلا، جمشید پور کے مشہد اور قتل گاہ کے بعد پڑی تھی، اس وفاق نے ہندوستانی مسلمانوں کو نیا حوصلہ عطا کرنے اور حکومت اور اکثریت کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اپنانے میں اس دور میں بڑا موثر کردار ادا کیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ مفید تنظیم ہمارے اپنوں ہاتھوں ایک بےجان ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ تاہم اس میں زندگی پیدا کی جا سکتی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام مسلم تنظیموں کے رہنما اور مختلف غیر جماعتی سربرآوردہ شخصیتیں ایک ایک کا دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں اس سنگین صورتِ حال اور ملت کے احساسات سے آگاہ کریں۔ دوسری طرف براہ راست عوامی رابطہ کے ذریعہ اس ملک کے عوام میں اتحاد و بھائی چارے کی ایسی مخلصانہ مہم کا آغاز کریں جو تحریک خلافت کی یاد تازہ کر دے اور برادران وطن یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ملتِ اسلامیہ خیر امّت ہے، اس کے پیش نظر پوری انسانیت کی بقاء اور فلاح ہے، یہ وہ پیام رکھتے ہیں جس سے پورا ملک خالی ہے۔ مسلمان زعماء کی براہ راست رابطہ مہم اس سازش اور کوشش کو ناکام کر سکتی ہے جو برادرانِ وطن میں فرقہ پرست شخصیتیں اور تحریکیں پیدا کرتی ہیں۔ اس تجربہ کو آزمائے بغیر یہ کہنا کہ "برادرانِ وطن کا ذہن بدلنا ناممکن ہے" ہمارے نزدیک خلافِ حقیقت بات ہے۔

تحریک پیام انسانیت کے نام سے جو محدود کوشش اس ملک میں ہو رہی ہے اس کے خوشگوار نتائج ہمارا رات دن کا مشاہدہ ہیں۔ لیکن اتنے وسیع و عریض ملک میں جہاں چاروں طرف فرقہ پرستی کی آگ لگی ہوئی ہے چند جلوپانی سے پوری طرح قابو پانا مشکل ہے۔ ہندوستان کے بارہ کروڑ مسلمان اگر خیر امّت کا کردار پیش کریں تو اس ملک کی قومی زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، اپنی افادیت اور اہمیت کو ثابت کر سکتے ہیں، اپنے خلوص اور خیرخواہی کو منوا سکتے ہیں۔ ایک مؤدبانہ گزارش مسلم سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور شعلہ بیاں مقررین سے ہے کہ وہ سنجیدگی اور خلوص سے اپنی سرگرمیوں، طرز عمل اور اسٹریٹجی کا جائزہ لیں۔ جنوبی ہند جہاں فرقہ پرستی کا نام و نشان نہ تھا وہاں بجائے اسلام کے آفاقی تصورات، محسن انسانیت کی رسالت اور تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کے ہم مسلم قومیت کے محدود و مادّی مفادات کی مہم چلاتے رہے، ہم ایک دنیادار سیاسی گروہ کی حیثیت سے معروف و متعارف ہوئے، امت دعوت کی کوئی جھلک ہمارے قول و عمل میں غیر مسلموں کو نظر نہیں آئی۔ ہمارے خوشحال مسلمان مادّی ترقی اور دولت کے حصول کے ریس میں اپنے اصل منصب و مقام کو فراموش کر بیٹھے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارا کاروبار، فیکٹریاں، کارخانے اور ان سے نکلنے والا دھواں فضا کو کثیف کرتا رہا، دلوں کا غبار بڑھتا رہا۔ مگر ہمارا وہ پہلو برادرانِ وطن کے سامنے نہ آیا جو غیروں کے دلوں میں محبت کے چمن کھلاتا تھا اور جسے اپنا کر اس خطۂ ارضی میں ہمارے اسلاف نے اللہ کے دین کے داعی، اسلام کے سپاہی اور ملت کے نگہبان اور پاسبان صنم کدوں سے پیدا کیے تھے۔

علمی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان

عربی زبان و ادب کے معروف اور ممتاز محقق مولانا عبدالعزیز میمن نوّے سال

تعلیم القرآن

از مولانا محمد اویس ندوی مرحوم

پاکی کا ادب

وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا (المائدہ ۶) اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

پاکی اور صفائی بڑی ضروری چیز ہے، دین کی جڑ پاکی ہی پر ہے، ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے بچتا نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پاکی کا اس قدر خیال تھا کہ جب سے اسلام لائے، عام طور سے ایک بار روزانہ غسل کرتے تھے۔

۱۔ حضورؐ نے فرمایا، جب کوئی شخص سو کر اٹھے، تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے، کیونکہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے!

۲۔ دانتوں کی صفائی کے لئے فرمایا، اگر میری امت پر بوجھ نہ ہوتا تو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

۳۔ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں پاخانہ نہ کرنا چاہئے۔

۴۔ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے۔

۵۔ استنجا بائیں ہاتھ سے کرنا چاہئے اور پانی کے ساتھ مٹی بھی استعمال کرنا چاہئے۔

۶۔ ہفتہ میں ایک دن مسلمان کے لئے غسل کرنا، کپڑے بدلنا، خوشبو لگانا اچھا سمجھا گیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ضروری ہے۔

لباس کا ادب

قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا (الاعراف ۳) ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہارا ستر اور زینت کا سامان۔

لباس کے دو مقصد ہیں:

۱۔ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے۔

۲۔ انسان کے بدن کے جن حصوں پر دوسروں کی نظر نہیں پڑنی چاہئے وہ چھپے رہیں، مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ، عورتوں کے لئے سر کے بالوں سے لیکر ٹخنوں اور گٹوں تک کا حصہ، ستر ہے، یعنی ان کا دوسرے کے سامنے کھولنا جائز نہیں تنہائی میں بھی کھولنا اچھا نہیں ہے۔ ایک صحابی نے حضورؐ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں، یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے اس سے اور زیادہ شرم کرنا چاہئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا، کبھی ننگے نہ ہو، اس لئے کہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو۔

۱۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہ پہننا چاہئے

۲۔ مردوں کے لئے عورتوں کا لباس اور عورتوں کے لئے مردوں کا لباس جائز نہیں۔

۳۔ مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہ بند کو اتنا نیچا نہ کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں، البتہ عورتیں دامن یا مہری نیچے تک لٹکا سکتی ہیں۔

۴۔ ایسا باریک کپڑا نہ پہننا چاہئے جس سے ستر دکھائی دے۔ عورتوں کے لئے خاص طور سے حضورؐ نے فرمایا کہ بعض کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔

۵۔ مرد شوخ رنگ، خاص کر سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں۔ زعفرانی کپڑے درست نہیں۔

۶۔ مردوں کے لئے حضورؐ نے سپید رنگ کے کپڑے پسند فرمائے ہیں۔

محسنِ انسانیتؐ نے فرمایا

حکومت ابتدا میں بہت خوبصورت نظر آتی ہے لیکن انتہا میں باعثِ ندامت ہوتی ہے۔

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال انكم ستحرصون علی الامارة وستكون ندامة يوم القيامة فنعم المرضعة وبئسة الفاطمة۔

(رواه البخاری مشکوٰة ص ۳۲۰)

ترجمہ: ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب کہ تم امیر بننے کی حرص کروگے حالانکہ تمہارے لئے امارت و حکومت قیامت میں باعث ندامت ہوگی اور حکومت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک دودھ پلانے والی عورت کہ ابتدا میں تو بہت پیاری لگتی ہے اور دودھ چھڑانے لگتی ہے تو وہی بہت بُری لگنے لگتی ہے (یہی حالت حکومت کی ہے کہ ابتدا میں حکومت بہت دلفریب نظر آتی ہے لیکن جب اس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہی بہت خوفناک بن جاتی ہے)

شرح: حکومت کی ابتدائی دلفریبی اور پھر اس کے عواقب کی بدنمائی جن اعتبارات سے شرعی نظر میں ہے ان کو آخرت سے غافل دماغوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے لیکن بظاہر جو بات موجودہ دماغوں میں آ سکتی ہے وہ اتنی واضح ہے کہ کسی زیادہ غور و فکر کی محتاج نہیں بلکہ آنکھوں سے دنیا کے موجودہ واقعات دیکھ کر نظر آ رہی ہے، ایک حکمراں جب تخت حکمرانی پر بیٹھتا ہے تو ابھی وہ جم کر بیٹھنے بھی نہیں پاتا کہ موت سر پر منڈلانے لگتی ہے، یہ تو ہیں زمانہ کے انقلابات اور لوگوں کی بے عقلی کے ثمرات۔ لیکن اگر ان سے قطع نظر کر لی جائے تو پھر بھی ایک حاکم کا یہ فرض ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ یہ سوچے کہ کتنے لوگوں کی زندگی اور راحت کی ذمہ داری اس کے سر پر عائد ہوتی ہے جس سے موجودہ دور میں عہدہ برآ ہونا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے۔

اگر حکومت انسانوں کی جان و مال سے کھیلنے کا نام ہو جیسا کہ موجودہ لوگوں کی ذہنیت بن گئی ہے تو یہ بات تو دوسری ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ ایک گھرانے کے والدین پر اپنے بچوں کی صحت، ان کی غذا، ان کی رہائش، ان کی تعلیم و تربیت کی کتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور صحیح طور پر ان کو انجام دینا ان کو کتنا مشکل ہوتا ہے تو صرف یہی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر نازک ذمہ داریاں چند افراد کی نہیں، بلکہ کروڑوں انسانوں کی اس کے سر عائد ہو جاتی ہیں، ان سب کو کامیاب طریقہ پر پورا کرنا کیا کوئی آسان بات ہے۔ لیکن حکومت کی چاشنی اور اقتدار کی ہوس ان سب کو ایسا فراموش کر دیتی ہے کہ گویا خدا کی مخلوق کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے جس کو وہ اپنی مرضی کے مطابق بدل کر اپنے مغرور نفس کو خوش کرتے رہتے ہیں، کیا حکومت اسی کا نام ہے؟ اسلام کا نہیں بلکہ انسانیت اور شرافت کا تقاضا یہی ہے، خوب یاد رکھئے کہ ایک حاکم کے بننے اور نہ بننے سے ایک ملک کا بگڑنا یا سنور جانا ہے، اگر سنور گیا تو اس سے بڑھ کر خوش قسمت کون ہے، اور اگر بگڑ گیا تو اس بدنصیب پر اس کے مرنے کے بعد بھی تاریخ لعنت کرتی رہتی ہے اس لئے عاقل شخص کب اتنی بڑی ذمہ داریوں کو خوشی کے ساتھ اپنے سر لے سکتا ہے، جن کی ادائیگی یقیناً انسان کے بس سے باہر ہے یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک شوہر جو اپنی چند بیویوں پر صرف ایک ادنیٰ درجہ کی حکومت رکھتا ہے جب وہ اس کو ادا کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے تو پھر یہ کتنا مشکل ہوگا کہ ایک حاکم عام کروڑوں انسانوں کے حقوق ادا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

اس عالم فانی میں گذارنے کے بعد رحلت فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون،
مرحوم اپنی عمر طبعی کو پہونچ چکے تھے لیکن وہ آخر عمر تک عربی زبان وادب کی خدمت کسی نہ کسی صورت میں کرتے رہے۔

مولانا عبد العزیز میمن گونڈال کاٹھیاوار (ہندوستان) میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے انہوں نے ابتدائی تعلیم جوناگڈھ کے مختلف دینی مدارس میں حاصل کی، ۱۹۰۱ء میں دہلی اور اس کے بعد رامپور، لکھنؤ اور پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ دہلی میں انہیں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد سے شرف تلمذ حاصل رہا۔

مولانا عبد العزیز میمن نے اورینٹل کالج لاہور، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں عرصہ تک تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دی۔ عربی زبان وادب میں جو تحقیقی کام میمن صاحب نے کیا اسے علمی دنیا میں بڑی وقعت اور اہمیت حاصل ہے۔ عربی زبان کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں جامعہ ازہر نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی تھی۔

مولانا عبد العزیز میمن آج اس جہان فانی میں موجود نہیں ہیں، لیکن ان کا علمی اور تحقیقی کام، ان کے سینکڑوں شاگرد ان کی خدمات کے تسلسل کو قائم اور ان کے نام روشن رکھیں گے، اور علم وادب کی دنیا میں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جائیگا۔

علم وادب کی معنوی خدمت کے ساتھ مرحوم نے مالی اور مادی تعاون میں بھی ایک مثال قائم کی، دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے لئے ایک خطیر رقم کا عطیہ انہوں نے دیا، جس سے عربی زبان وادب کی منتخب کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مرحوم کے نام سے "گوشۂ مولانا عبد العزیز میمن" کتب خانہ ندوۃ العلماء کی زینت اور ایک قیمتی اضافہ کی شکل میں موجود ہے، پاکستان میں بھی عربی زبان وادب کے کسی ادارے یا اکیڈمی کو مرحوم کے نام پر منسوب کیا جانا چاہئے تاکہ یہ یادگار عربی زبان کے شائقین میں ایک تحریک پیدا کرتی رہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا میمن مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اپنی مغفرت سے نوازے اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب فرمائے۔

(مولانا عبد العزیز میمن مرحوم پر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا پر مغز اور موثر مضمون اسی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے)

کرکٹ کا کھیل ___ نظر ثانی کا محتاج

کرکٹ کو شاہی کھیل (Royel Game) کہا جاتا ہے۔ برطانیہ میں فیوڈل دور میں زمینداروں اور جاگیرداروں نے وقت گذاری کا مشغلہ اسے بنایا۔ انگریز اس کھیل کو ہندوستان ساتھ لائے، یہاں کی زمین بھی اس کھیل کے لیے سازگار ثابت ہوئی، کیونکہ یہاں راجوں، مہاراجوں، نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں نے اس کھیل کی سرپرستی کی، وقت اور مال اس کھیل کی بنیادی ضرورت تھی، اور یہ دونوں چیزیں مذکورہ بالا طبقہ کے پاس وافر مقدار میں تھیں، ہندوستان کے مشہور کرکٹ کھلاڑیوں اور اس کھیل کے سرپرستوں میں نواب پٹودی، نواب مانگرول، مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ ہولکر، مہاراجہ پٹیالہ کا نام آتا ہے۔ انگریزوں نے اس کھیل کو عوام میں مقبول بنانے اور اس کے ذریعہ فرقہ وارانہ مسابقت اور منافرت پیدا کرنے کے لیے رنگی مقابلوں کی ہمت افزائی کی۔ ہندو کرکٹ ٹیم، مسلم کرکٹ ٹیم، عیسائی ٹیم، پارسی ٹیم، مذہبی بنیادوں پر ان ٹیموں کے ٹورنامنٹ ہوتے تھے جن میں اکثر ایسا ہوتا کہ ہندو اور مسلم ٹیمیں فائنل میں پہونچتیں، لوگ اسے کفر واسلام کی جنگ سمجھتے اور جوش جنوں میں فرقہ وارانہ منافرت خونریز تصادم میں بدل جاتا۔ سنا ہے کہ اس دور میں ریڈیو کومنٹری طالع یار خاں کی ہوتی تھی جو اپنے مخصوص انداز میں سننے والوں کے ذہن پر چھا جاتا تھا، کومنٹری سننے والے جوش وخروش کے عالم میں کبھی پھولوں کو ریڈیو پر لاد دیتے اور کبھی خلاف توقع نتیجہ پر ریڈیو پر غصہ اتارتے۔

انگریز اس ملک سے جا چکے لیکن کرکٹ اپنی پوری جنوں سامانیوں کے ساتھ موجود ہے اور برصغیر میں اس کے شیدائیوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہماری قومی زندگی میں اس گراں قیمت، طویل اور اکتا دینے والے کھیل کے نقصانات کا اندازہ کیجئے۔ دفتروں میں کام متاثر، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی متاثر۔ وقت اور پیسے کا ایسا ضیاع جو ہند وپاک جیسے غریب اور ترقی پذیر ممالک کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔ کیا ہمارے قومی رہنما، قومی مفاد اور برصغیر کی دیرینہ روایات کی خاطر اس کھیل کی ہمت افزائی پر نظر ثانی کی زحمت فرمائیں گے؟

امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ کے چند سرکاری خطوط

گورنروں کے نام

واضح ہو کہ خدا نے حکام وعمال کو اس بات کی تاکید کی ہے کہ رعایا کی دیکھ بھال کریں اور اس بات کی تاکید نہیں کی کہ رعایا سے ٹیکس وصول کریں۔ مسلمانوں کے اولین حاکم رعایا کے خادم تھے محصل ٹیکس نہ تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حکام ابھی خدمت رعایا کے بجائے منصب سے ہٹ کر ٹیکس وخراج وصول کرنے کی حد ود میں لگ جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو حیا، ایمانداری اور ایفائے عہد سب رخصت ہو جائیں گے۔ یاد رکھئے، سب سے زیادہ بہتر طرز عمل یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے مفاد اور معاملات میں دلچسپی لیں۔ اسلام کے دیئے ہوئے حقوق سے ان کو بہرہ ور کریں اور اسلام کے حقوق جو ان پر ہیں وہ ان سے وصول کریں، مسلمانوں کے بعد ذمیوں کے مسائل ومعاملات سے آپ کو دلچسپی لینی چاہئے۔ آپ کے ذمے ان کے حقوق ہیں وہ ان کو دیجئے اور ان کے ذمے آپ کے جو حقوق ہیں وہ ان سے لیجئے۔ ذمیوں کے بعد دشمنوں سے آپ کا طرز عمل درست ہونا چاہئے ایمانداری اور وفائے عہد کے ذریعہ ان پر فتح حاصل کیجئے۔

سرحدی کمانڈروں کے نام

واضح ہو کہ آپ مسلمانوں کے نگہبان ومحافظ ہیں۔ عمرؓ نے آپ کے لئے جو ضابطہ سیرت مقرر کیا تھا۔ اس سے ہم واقف ہیں بلکہ ہمارے مشورے ہی سے اسے مقرر کیا گیا تھا۔ خیال رکھئے کہ آپ کی کسی بدعنوانی کی شکایت میرے پاس نہ آئے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ کا منصب چھن جائے گا اور آپ سے بہتر لوگوں کو آپ کی جگہ مقرر کیا جائے گا۔ اپنی سیرت پر نظر احتساب رکھئے۔ مجھ پر بحیثیت خلیفہ جو ذمہ داریاں ہیں میں انہیں ضرور انجام دوں گا۔

خراج افسروں کے نام

واضح ہو کہ خدا نے مخلوق کو حق وانصاف کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس لئے وہ بس حق وانصاف ہی قبول کر سکتا ہے۔ لہٰذا جب آپ خراج وصول کریں تو حق وانصاف سے کام لیں۔ اور جب دوسروں کے حقوق ادا کریں تو حق وانصاف کے ساتھ کریں۔ میری طرف سے دیانتداری کی سخت تاکید ہے۔ اس پر ثابت قدمی سے قائم رہئے۔ ایسا نہ ہو کہ دیانت کا دامن سب سے پہلے آپ ہی کے ہاتھ سے چھوٹے اور اگلی نسلوں کی بد دیانتیوں میں آپ کو بھی شریک کیا جائے۔ امانت ودیانت کے ساتھ ضروری ہے کہ آپ اپنے عہد وپیمان پر بھی قائم رہیں۔ کسی یتیم کا حق نہ ماریئے۔ نہ کسی معاہد کے ساتھ زیادتی کیجئے کیونکہ ان کے ساتھ زیادتی کرنے والے سے خدا مواخذہ کرے گا۔

صدر مقاموں کے مسلمانوں کے نام

خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان غنیؓ نے یہ خط اس وقت لکھا جب باغیوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا اور حالات نہایت نازک ہو چکے تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ عز وجل نے محمد کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے خدا کے احکام لوگوں تک پہنچائے اور جب اپنا کام پورا کر چکے تو پھر اپنے رب سے جا ملے۔ انہوں نے ہمارے لئے ایک کتاب چھوڑی جس میں جائز وناجائز نیز ان امور کا ذکر ہے جو مقدر ہو چکے ہیں اور جن کو حضرت محمدؐ نے لوگوں کی پسند ناپسند سے بے نیاز ہو کر نافذ کیا۔ ان کے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ پھر مجھے میرے علم اور خواہش کے بغیر اصحاب شوریٰ میں شامل کیا گیا۔ انہوں نے خاص وعام کی متفقہ رائے سے اور میری خواہش کے بغیر مجھے خلیفہ منتخب کیا۔ خلیفہ ہو کر میں نے بھلے کام کئے اور ایسی روش اختیار نہیں کی جس پر کسی کو اعتراض ہو یا ناگواری کا موقع ملتا۔ میں اپنے کاموں میں رسول اللہ اور شیخین کا تابع رہا اور خود متبوع بننے کی کوشش نہیں کی اور دولت وثروت پا کر لوگوں کا میلان شر اور فتنے کی طرف ہوا تو حسد اور کینہ ان کے دلوں میں جاگ اٹھا اور دنیاوی فائدے کا بھوت ان کے سر پر سوار ہو گیا۔ حالانکہ نہ تو میں نے قابل گرفت کوئی کام کیا اور نہ ماضی میں کسی ایسے فعل کا مرتکب ہوا جس کے انتقام کی خلش دلوں میں ہوتی۔ کینہ اور حسد نے ان کو منافق بنا دیا ہے۔ ان کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان سے کچھ کہتے ہیں وہ ایسے کاموں پر مجھے برا بھلا کہنے لگے جن کو ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہد میں انہوں نے بخوشی قبول کیا تھا اور ایسے فیصلوں پر مجھے مطعون کرنے لگے جو نہایت مناسب تھے اور اہل مدینہ کے مشورے سے کئے جاتے۔ برسوں میں ان کی نکتہ چینی اور عیب جوئی برداشت کرتا رہا۔

ان کی حرکتیں آنکھوں سے دیکھتا اور ان کی باتیں کانوں سے سنتا۔۔۔ لیکن انہیں کوئی سزا نہ دیتا۔ انہوں نے میرے صبر وتحمل کو کمزوری سمجھا۔ ان کی جرأت اتنی بڑھی کہ انہوں نے رسول اللہ کے گھر، مزار اور ہجرت گاہ میں میرے اوپر حملہ کر دیا۔ بہت سے بدو عرب ان کے ساتھ ہو گئے ہیں اور انہوں نے ان عربوں کی طرح جو احد میں ہم پر حملہ آور ہوئے تھے، یورش کر دی ہے آپ میں سے جس کے لئے ممکن ہو میرے پاس آ جائے۔ والسلام۔

مُفت

ہر علم وفن کی کمیاب اور نئی کتابیں منگائیے۔

کتابوں کی فہرست مُفت طلب فرمائیے

مُونس بک ڈپو۔ بدایوں (یو۔پی)

(۲۴۳۶۰۱)

مولانا عبد العزیز میمن مرحوم

از: مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

اس عہد میں عربی زبان وادب میں سند کا درجہ رکھنے والے اور اس تحتی براعظم ہند وپاک کے لئے سرمایۂ فخر ونازش

مولانا عبد العزیز میمن کا نام جہاں تک یاد ہے سب سے پہلے اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب سے سنا جو اورینٹل کالج لاہور میں ان کے ساتھ تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے اور جو ادب ولغت عربی میں انکے ہم مذاق اور الفاظ کی صحت وتحقیق عربی اشعار وقصائد کے حفظ میں (سن وسال کے تفاوت کے ساتھ) رفیق وشریک تھے، اس واقفیت کی تاریخ ۱۹۲۶ء سے شروع ہو جاتی ہے، جب میرے علمی اور تاریخی شعور نے پر وبال نکالنے شروع کر دیے تھے اور کچھ اچھا برا سمجھنے لگا تھا، عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب مولانا میمن کا تذکرہ اس انداز سے کرتے تھے کہ اسمیں ان کے علم وفضل کا اعتراف بھی تھا اور کچھ ان کے اپنے علم ومحنت کے (ضرورت سے زائد) احساس وخود اعتمادی پر ہلکی سی معاصرانہ ورفیقانہ تنقید بھی، میرے نزدیک یہ ہر ایسے صاحب فضل ومحقق کی طبیعت کا خاصہ ہے جو اپنے معاصرین سے واضح طریقہ پر فائق ہو اور جس کی دنیا علم وتحقیق کے اندر محدود اور اہل قلوب، وتزکیہ نفس کے اُستادوں کے حلقہ سے دور ہو، اس زمانہ میں عربی لُغت وادب کے دو عالموں کا ساتھ نام سنتا تھا جو اس میدان کے شہسوار اور ایک دوسرے کے ہم پلہ مانے جاتے تھے، واقفین حال میں سے بعض اصناف ادب ولُغت میں کسی کو ترجیح دیتے تھے اور بعض کسی کو، یہ دونوں وطنی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب، استادوں میں بھی ایک دوسرے کے شریک اور مسلک (عمل بالحدیث) میں متفق تھے، ان میں ایک مولانا عبد العزیز میمن تھے دوسرے ابو عبد اللہ مولانا محمد سورتی سورتی صاحب کی زیارت تو جلد میسر آگئی اس لئے کہ وہ ہمارے استاد مولانا خلیل عرب صاحب کے دوست تھے لکھنؤ آتے اور کبھی کبھی دن اُن کے ہاں ٹھہرتے، ٹونک میں ان کی شادی ہوئی تھی

جو ہمارے اعزہ کا وطن اور ایک خاندانی مسکن تھا مولانا میمن اورینٹل کالج کے تعلق سے زیادہ تر لاہور رہتے تھے، مئی ۱۹۲۹ء میں جب میرا لاہور کا پہلا سفر ہوا تو وہ ترک تعلق کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے وابستہ ہو چکے تھے۔ قرب مکانی اور گوناگوں تعلقات کے باوجود میرا عرصہ تک علی گڈھ جانا نہیں ہوا، البتہ عربی ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم اور اس کا ایک شیدائی ہونے کی وجہ سے اُن سے ایک قرب ومناسبت محسوس ہوتی تھی، اس وقت ہندوستان میں المجمع العلمی العربی دمشق کے دو ہی رکن تھے، ایک حاذق الملک حکیم اجمل خاں، دوسرے مولانا عبد العزیز میمن، شام کی اس علمی اکیڈمی کو مشرق وسطیٰ میں اولیت اور بعض حیثیتوں سے بڑی اہمیت حاصل تھی، اس کے بانی اور مستقل صدر شام کے مشہور فاضل وادیب علامہ کرد علی تھے، اس کی رکنیت بہت بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا تھا جو نامور اور سربرآوردہ یورپین مستشرقین اور گنے چنے مشرقی فضلاء وادباء کو حاصل تھا، مولانا میمن کے مضامین بڑے آب وتاب کے ساتھ المجمع العلمی کے سہ ماہی رسالہ میں شائع ہوتے تھے، وہ زیادہ تر فنی وتحقیقی ہوتے تھے جو میرے سن وذوق کے لحاظ سے کسی قدر خشک اور غیر دلچسپ ہوتے۔

مولانا سے براہ راست علمی وکتابی تعارف ان کی شاہکار تصنیف "ابو العلاء وما الیہ" کے ذریعہ ہوا جسے میں نے اپنے استاد شیخ خلیل عرب اور مولانا عبد الحلیم صدیقی مرحوم سے بڑی محنت سے پڑھا تھا اور اس کا بڑا حصہ زبانی یاد اور مستحضر تھا جس کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا کا رسالہ "فائت شعر ابی العلاء"[1] نکلا تو میں نے اس پر استدراک کیا، اور الضیاء کے ایک مضمون کے ذریعہ ان کی خدمت میں بڑے ادب سے عرض کیا کہ اس میں متعدد شعر ایسے آ گئے ہیں جن کے متعلق مصنف علام نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ معری کے کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے حالانکہ وہ "سقط الزند" میں موجود ہیں یہ اسی شیفتگی اور حفظ کا نتیجہ تھا، ابو العلاء کے

سلسلہ میں مصر کے مشہور صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو آخری سند سمجھا جاتا تھا، جن کو جسمانی وذہنی کئی طریقوں سے ابو العلاء سے مناسبت تھی، ان کی کتاب "ذکری ابی العلاء" کی مشرق وسطیٰ میں دھوم مچی ہوئی تھی، عربی ادب کے طالب علم اس کو پڑھ کر جھوم جھوم جاتے تھے، لیکن میمن صاحب کی کتاب "ابو العلاء وما الیہ" نے اس کو بہت پیچھے چھوڑ دیا طٰہٰ حسین لفظ واسلوب کا جادوگر ہے لیکن لغت وشعر کی نوک پلک درست کرنے، قدیم قلمی وکرم خوردہ نسخوں کی تصحیح ومقابلہ، روایات وبیانات کے تقابل وترجیح اور اغلاط ومسامحات کی تصحیح کا مرد میدان نہیں، اس کے لئے بصارت وبصیرت، دیدہ ریزی وجگر کاوی اور بڑے صبر وتحمل کی ضرورت ہے اور طٰہٰ حسین اپنے دوسرے کمالات کے ساتھ اس سے عاری تھے[2]۔

میں نے بڑے شوق سے ایک دن شبلی بک ڈپو جا کر جو لکھنؤ میں مصر وبیروت کی عربی مطبوعات کا واحد مکتبہ تھا "ابو العلاء وما الیہ" خریدی اور پڑھی، اور مولانا کی تحقیق ومطالعہ اور کاوش ومحنت کا قائل ہو گیا انکے اسلوب وطرز انشاء سے تو کچھ زیادہ مناسبت نہیں ہوئی کہ بقول اس کتاب کے ایک فاضل تقریظ نگار کے کہ انہوں نے اپنی انشاء وتحریر میں ابو العلاء کے اس اسلوب کی تقلید کی ہے جو اس نے اپنے "رسالۃ الغفران" میں اختیار کیا ہے، میں کچھ اپنی علمی بے بضاعتی کی بنا پر اور کچھ شروع سے متقدمین میں ابن المقفع، متوسطین میں عبد القاہر جرجانی اور متاخرین میں النظرات کے مصنف مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے اثر سے سلیس غیر مقفیٰ اور رواں عربی لکھنے کی کوشش کرتا تھا جس میں قدیم عہد عباسی کی نثر کا رنگ نمایاں ہو، لیکن اس کے باوجود مولانا بہر حال استاد عربی زبان کے محقق اور کہنہ مشق ومسلّم نقاد اور مورخ تھے، لیکن "ابو العلاء وما الیہ" سے بھی بعض حیثیتوں سے بڑھ کر مولانا کا تحقیقی وعلمی کارنامہ سمط اللآلی ہے اس کا تعلق ابو علی

القالی کی معرکۃ الآراء کتاب "الامالی" سے ہے جو مولانا کی محبوب ترین عربی کتابوں میں تھی اور وہ اس کو نوادر لغت وشعر کا بہترین ذخیرہ سمجھتے تھے اس کتاب میں ان کی دیدہ دری اور دیدہ ریزی کی داد اس زمانہ کے اچھے اچھے ادیبوں نے دی، غالباً اکتوبر ۱۹۳۴ء تھا کہ میں کسی تقریب سے علی گڈھ گیا مولانا کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق اور عربی زبان کے اس فاضل ومحقق کو دیکھنے کا شوق تھا جس نے فضلاء عرب ومحققین زبان سے اپنے مطالعہ وتحقیق کا لوہا منوالیا تھا اور جس سے ہندوستان کو عزت وشرف حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے ہم لوگوں نے رسالہ "الندوہ" میں "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا جسمیں ہندوستان کے مشاہیر اہل علم اپنی اُن محسن کتابوں کا ذکر کرتے جنھوں نے ان کی ذہن وسیرت کی تشکیل وتعمیر میں خاص حصہ لیا ہے، قارئین اور تازہ واردان بساط علم کی رہنمائی فرما رہے تھے، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبید اللہ سندھی اور متعدد مشاہیر اہل علم کے مضامین شائع ہو چکے تھے، مجھے خیال ہوا کہ مولانا سے بھی اس عنوان پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی جائے کہ عربی لغت وادب میں وہ اس وقت سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کے جانشین اور کم سے کم ہندوستان میں اس باب میں فرد فرید ہیں۔ میں ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا میری کتاب "مختارات من ادب العرب" جو قرن اول سے قرن حاضر تک کے عربی نثر کے نمونوں پر مشتمل ہے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کے لئے لکھی گئی تھی[3] تازہ تازہ چھپ کر نکلی تھی، میں نے کسی قدر شرم اور کسی قدر خوف کے ساتھ مولانا کی خدمت میں پیش کی کہ معلوم نہیں مولانا اس پر کیا تبصرہ فرمائیں اور وہ ان کی نظر میں جچے یا نہیں لیکن مولانا کی (جو اپنے حلقۂ احباب وتلامذہ

[1] وہ شعر جو ابو العلاء معری کے مطبوعہ دیوانوں میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔

[2] ملحوظ رہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین پیدائشی طور پر نظر سے معذور تھے، ادبی حلقوں کی داد وتحسین اور مصر کے مخصوص حالات نے ان کے اندر اپنے افکار وخیالات کی اشاعت میں عجلت وبے صبری پیدا کر دی تھی۔

[3] اب یہ کتاب ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں اور سعودی عرب کے مدارس ثانویہ کے نصاب میں داخل ہے، ایک زمانہ میں دمشق کے کلیۃ الشریعۃ کے نصاب میں بھی داخل تھی۔ (مدیر)

می تعریف میں بڑے محتاط مشہور تھے) بزرگانہ شفقت اور فراخدلی تھی کہ مقدمہ پر اسی وقت نظر ڈال لی اور فرمایا کہ " مولوی صاحب ! آپ عربی بڑی خوبصورت لکھتے ہیں " زبان و انشاء کے بارے میں خوبصورت کا لفظ میں نے سب سے پہلے انہی کی زبان سے سنا اور ایک مسلم الثبوت استاد کی زبان سے آنا فقرہ سنکر یہ محسوس ہوا ؎

کلاہ گوشہ دہقاں بآفتاب رسید

میں نے موقع پاکر ان سے محسن کتابوں پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی جو انہوں نے بلا تردد قبول فرمالی مجھے انہوں نے شام کو اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی حاضر ہوا تو خاصا تکلف تھا، انہوں نے مضمون

ڈکٹیٹ کرایا یہ پُر مغز اور

معلومات افزا مضمون "الندوہ"

نومبر سنہ ۴۱ء کے شمارہ میں

شائع ہوا آج بھی یہ مضمون

عربی زبان وادب نحو وبلاغت

کے طلبہ نہیں بلکہ فضلاء کے

لئے رہنما اور چشم کُشا اور

معلومات کا خزانہ ہے، اسی

سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا۔

کہ وہ اردو کے مشہور ادیب

ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد

ہیں، اور اگرچہ ان سے زیادہ دن نہیں پڑھا لیکن وہ اب بھی ان کی قابلیت اور عربی نظم پر ان کی قدرت کے قائل ہیں، اس مضمون سے بہت سی ایسی کتابوں اور مصنفین کا تعارف ہوتا ہے جو برصغیر کے علمی و مدرسی حلقوں میں اب بھی غیر معروف و نامانوس ہیں، اس صحبت سے واپس آیا تو علیگڑھ کے طلبہ واحباب کو مضمون کی فرمائش قبول کرنے اور ایسا فاضلانہ مضمون لکھانے سے زیادہ ان کی پر تکلف دعوت کرنے پر تعجب تھا اس لئے کہ حلقۂ احباب و تلامذہ میں ان کی کم آمیزی اور کفایت شعاری معروف و مسلم تھی وہ اس کو میری بڑی خوش قسمتی اور اعزاز سمجھ رہے تھے۔

کم لوگوں کو اس کا اندازہ ہوتا

ہے کہ انسان کتنے متضاد اوصاف

وخصائص کا مجموعہ ہے وہ کسی چیز میں

اور کسی وقت بڑا فیاض، فراخ چشم،

ثابت ہوتا ہے بادشاہوں سے لیکر

علماء اور درویشوں تک کی زندگی

اس تضاد کا عجیب وغریب نمونہ اور

مد و جزر کا عجیب وغریب مظہر

ہوتی ہے، مولانا میمن صاحب کے متعلق علی گڑھ میں ایسے بہت سے لطائف مشہور تھے، ان کی جزرسی، سفروں میں بھی کفایت شعاری، طلبہ کو اپنے معلومات سے مستفید کرنے میں بھی کسی قدر بخل و استغناء اپنے کتب خانہ کے قلمی کتابوں اور نوادر کے بارے میں احتیاط و حفاظت، لیکن بعد کے واقعات بتائیں گے کہ ان کی اس انسانی شخصیت کے اندر ایک دوسری شخصیت خوابیدہ تھی جس کا علم ان کے قریبی دوستوں کو بھی نہیں ہوا، اور جو اپنے مناسب وقت پر بیدار و نمایاں ہو کر اپنی فیاضی، علم دوستی اور اولوالعزمی سے قریب ترین عزیزوں اور شاگردوں کو محو حیرت بنا گئی۔

تقسیم ہند کے بعد یا اس سے کچھ پہلے وہ لاہور چلے گئے، اورینٹل کالج اور کراچی یونیورسٹی خوش نصیب تھی کہ ان سے فائدہ اٹھانے اور ان کے ذریعہ طلبہ کو فائدہ پہنچانے کا اس کو موقع ملا اس عرصہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے، ملک کی تقسیم

ہوئی تو میں حجاز میں تھا یہ

میرا پہلا سفر حج تھا، مسجد نبوی

میں میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک

سوڈانی عالم میرے پاس آئے

اور مجھ سے پوچھا کہ پاکستان کا

صدر کس کو بنایا گیا؟ میں نے

کہا کہ مسٹر جناح کو! کہنے لگے کہ بڑے

افسوس کی بات ہے کہ جب

ملک میں علامہ عبدالعزیز میمن

جیسا یگانۂ روزگار فاضل موجود

ہو وہاں کسی دوسرے کو صدر

بنایا جائے، میں نے ان سے

بحث مناسب نہیں سمجھی اور

مسکرا کر خاموش ہو گیا،

معلوم نہیں اس لطیفہ کی خبر مولانا کو کیسے پہونچی کہ جب میں جولائی سنہ ۶۰ء میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے یہ لطیفہ سناکر ان کو اور حاضرین کو مسرور و محظوظ کرنا چاہا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے یہ لطیفہ پہونچ چکا ہے، حیرت ہے کہ اس وقت میرے اور خواہر زادہ عزیز مولوی سید محمد ثانی سلمہ کے سوا کوئی اور نہ تھا ممکن ہے میں نے کسی پاکستانی دوست سے تفریحًا اس کا ذکر کیا ہو اور شدہ شدہ یہ روایت ان تک پہونچ گئی ہو، اس سے اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ انکی شہرت

کہاں کہاں تک پہونچ چکی

تھی اور عرب ممالک کے اہلِ

علم واہل ذوق کے دل میں

ان کی کیا قدر و منزلت تھی،

عرصہ تک ہندوستان میں ان کی صحت، مشاغل اور تصنیفی و تحقیقی سرگرمیوں کے بارے میں مطلقًا لاعلمی و بے خبری رہی، کبھی کبھی کوئی جاننے والا پوچھ لیتا کہ مولانا زندہ ہیں یا نہیں؟ اچانک ان

کے عزیز و نامور شاگرد ڈاکٹر

سید محمد یوسف صاحب کا خط

میرے نام آیا کہ مولانا ایک

خطیر رقم کتب خانہ ندوۃ العلماء

کے لئے دینا چاہتے ہیں ان کی

خواہش ہے کہ اس سے کوئی

ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ رقم

محفوظ رہے اور اس سے مستقل

فائدہ اٹھایا جاتا رہے میں نے

لکھا کہ اس کی سب سے زیادہ

موزوں و محفوظ شکل یہ ہے کہ

اس سے وہ اہم کتابیں اور جدید

مطبوعات خریدی جائیں، جو

کتب خانہ میں نہیں ہیں اور

مولانا کے نام کا ایک گوشہ

(Corner) قائم کر دیا جائے

جس میں یہ سب کتابیں رہیں

اور طلبہ وفضلا اور تحقیقی کام

کرنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں،

مولانا نے اس تجویز کو پسند کیا۔

اور رقم حوالہ کر دی،

خوش قسمتی سے ۶، ۷، ۸ رجولائی کو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے کراچی میں ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کا فیصلہ کیا گیا، میں اپنے عزیز رفیق کار مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں جدہ سے کراچی شرکت کے لئے گیا، لکھنؤ سے عزیزان محمد الحسنی اور مولوی اسحٰق جلیس ندوی شرکت کے لئے آئے۔ معلوم ہوا کہ مولانا علیل ہیں اور ملنا چاہتے ہیں، میں بھی اپنے رفقاء کے ساتھ سراپا شوق بنا ہوا ان کی خدمت میں حاضر ہوا بڑی محبت اور گرمجوشی سے ملے میں نے اس گرانقدر عطیہ کا شکر ادا کیا فرمایا اتنی ہی رقم اور پیش کروں گا۔

اثنائے گفتگو میں میں نے

عرض کیا کہ اگر بے ادبی نہ ہو تو اتنا

پوچھوں کہ جناب کو عربی کے کتنے اشعار

یاد ہوں گے؟ چند سیکنڈ توقف کرنے

کے بعد فرمایا کہ پون لاکھ سے ایک

لاکھ تک!

مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا اس لئے کہ میں نے مولانا سید طلحہ صاحب سے ان کے محفوظ اشعار کی ہزاروں کی تعداد سُنی تھی اور علی گڑھ کی مجلس میں انہوں نے خود دیوان حماسہ کے متعلق کہا تھا کہ ان کو پورا یاد ہے، علمائے متقدمین وادبائے سلف میں تو اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی لیکن غالبًا اس عہد میں یہ تحتی براعظم تو الگ رہا ممالک عربیہ میں بھی شاید اس کی کوئی دوسری مثال ملے، مولانا نے اپنا یہ دوسرا وعدہ بھی پورا کر دیا اور معلوم ہوا کہ انکے عزیزوں شاگردوں اور دوستوں نے ان کے اندرون میں اتر کر ان کی فیاضی و دریادلی کا انکشاف نہیں کیا تھا جو ان کے عام حالات سے کوئی میل نہیں رکھتی تھی اور ان کو بہت سے اہل علم واہل دل کی طرح یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نجست اسرار من

میں ابھی لاہور ہی میں تھا کہ عزیزی قاری سید رشید الحسن صاحب کے خط سے یہ معلوم کرکے بڑا صدمہ ہوا کہ ابھی کچھ روز ہوئے لندن سے ان کے عزیز ترین اور مایۂ ناز شاگرد ڈاکٹر سید محمد یوسف کے انتقال کی خبر آئی اور انکی نعش کراچی لائی جارہی ہے، کراچی کی اس صحبت میں بھی برادر محترم سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان سے جو ان کے عزیز بھی ہیں ان کی متوقع آمد کے متعلق دریافت کر رہے تھے اور ان کے لئے چشم براہ تھے، مجھے اندازہ تھا کہ اس روح فرسا خبر کا ان پر کیا اثر پڑا ہوگا، میں نے وہیں سے ان کو تعزیتی خط لکھا، کیا معلوم تھا کہ چند ہی مہینوں کے بعد ان کے ارتحال کی خبر سننی پڑے گی یوں تو ان کی عمر نوّے سے تجاوز کر چکی تھی لیکن ان کے ہوش وحواس بگاہ اور دماغ اب بھی کام کر رہے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ اس عزیز شاگرد کی مفارقت نے جوان کا قوت بازو بنا ہوا تھا، ان کی صحت پر گہرا اثر ڈالا بہرحال وقت موعود آپہونچا تھا میں بمبئی میں تھا کہ ۲ یا ۳ نومبر کو ہمارے عزیز میزبان جو انکے اس عطیہ سے واقف تھے دعوت کا پرچہ لے کر آئے جس میں انکی وفات کی خبر تھی ہزاروں پڑھنے والوں میں سے چند ہی کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ برصغیر ہی نہیں یہ عہد اور عالم عربی کسی عظیم المرتبت ادیب اور عربی زبان کے مبصر و محقق سے محروم ہوگیا زمانہ کے حالات تعلیمی نظام اور قدیم و جدید مدارس کی جو کیفیت اس وقت دیکھنے میں آرہی ہے اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ ان کا جیسا متبحر مستند اور صاحب نظر عربی زبان وادب کا عالم پیدا ہوگا میں نے ان کے تعزیتی خط میں جو الفاظ لکھے تھے ان میں ذرا مبالغہ نہیں سمجھتا اور اسی پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں "حجۃ اللغۃ العربیۃ ومفخرۃ القارۃ الھندیۃ (اس عہد میں عربی زبان و ادب میں پسند کا درجہ رکھنے والے اور اس تحتی براعظم ہندوپاک کے لئے سرمایۂ فخر و نازش۔

ملک کی اخلاقی قیادت

مسلمانانِ ہند کی ذمّہ داری ہے

یہ ہمارا اپنا ملک ہے اس کی تباہی ہماری اپنی تباہی ہے اس کی بستیوں میں رہنے والے پڑوسیوں کا آپس میں لڑنا اور ایک کا دوسرے پر حملہ آور ہونا یا ایک کی دوسرے پر بداعتمادی ہم سب کے لئے تکلیف دہ ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر حکومت اور اکثریت باہمی اعتماد کو بحال کرنے اور یکجہتی پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں تو ہمیں اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ کچھ زیادہ شدت سے ہی اس کا احساس کرنا چاہیئے اپنی پچھلی تاریخ میں صدیوں تک مسلمانوں نے تعلیم، قانون، قیام امن وامان۔ عوامی خدمت، انسانی محبت و شفقت، مساوات ملکی وحدت، معاشرتی اصلاح، فن تعمیر، یکجہتی اور دوسرے میدانوں میں ایک ممتاز رول ادا کیا ہے اور اب پھر انہیں دوسروں کی طرف نظریں جمانے کے بجائے خود ہی آگے بڑھ کر اپنا رول ادا کرنا ہے۔ اس اجتماع میں علی گڈھ، سنبھل، سہارن پور، بنارس، پنت نگر، کانپور، پرنام بٹ، دہلی، حیدرآباد، اڈونی اور دوسرے متعدد فرقہ وارانہ حادثات پر بھی تفصیلی طور پر غور کیا گیا اور یہ اجتماع اس نتیجہ پر پہونچا کہ ان میں ہر جگہ انتظامیہ حالات کو سدھارنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ نیز پولیس اور خاص طور سے پی۔ اے۔ سی کا رول بہت شرمناک رہا ہے۔

عوام کی جان ومال کی حفاظت حکومت کا فرض ہے۔ اسی طرح حفاظت خود اختیاری عوام کا قانونی حق ہے۔ اگر کوئی حکومت اپنا فرض ادا نہ کر سکے تو اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(مسلم مجلس مشاورت کی قرارداد سے)

خط وکتابت کرتے وقت حوالہ نمبر خریداری ضرور تحریر کریں۔

انسانیت دکھی ہے

آج ساری دنیا فکر و پریشانی میں مبتلا ہے، انسانیت بدامنی اور قتل و غارت کی شکار ہے۔ ہر طرف ایک اضطراب اور بے چینی طاری ہے، ہر شخص بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پریشان ہوتا جارہا ہے۔ فسادات لاقانونیت، ظلم و زیادتی اور جان و مال، عزت و آبرو کے عدم تحفظ کے خیال نے پُرامن شہریوں، ملک کے بہی خواہوں اور انسانیت کے دردمندوں کو بے چین و مضطرب کر دیا ہے ـــ لیکن انکی کوئی تنظیم نہیں۔ ان کی کہیں آواز نہیں۔

تحریک پیام انسانیت

ایسے انسانوں کو منظم کرنے اور ان کی صدا کو عام کرنے کی ایک محدود کوشش اور مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔ اس ملک کی وسعت اور یہاں کی آبادی کی کثرت کو دیکھتے ہوئے۔ اس دعوت کو وسیع بنیادوں پر چلانے اور اس نامانوس صدا کو کشمیر سے کرناٹک تک عام کرنے کے لیے ہم اس ملک کے تمام باشندوں کا بلاتفریق مذہب و ملت تعاون چاہتے ہیں۔

۱۔ ملک کی ہر ریاست، ہر شہر، ہر قصبہ تک تحریک پیام انسانیت کی دعوت، اغراض و مقاصد کا تعارف کرانے کے لیے جلسوں، کارنر میٹنگز اور عوامی رابطہ کا پروگرام بنایئے اور ہمیں لکھئے، مرکز سے تعلق رکھنے والے رفقاء اس اہم کام میں آپ کا تعاون کریں گے۔

۲۔ اپنے اپنے علاقوں میں ایسے دوروں کا پروگرام ترتیب دیجئے جس میں داعیٔ تحریک مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بنفس نفیس تشریف لاسکیں۔

۳۔ تحریک پیام انسانیت کا حلف نامہ اور ضروری لٹریچر علاقائی زبانوں میں ترجمہ کراکر عام کیجئے۔ تحریک سے متفق لوگوں سے فارم پُر کرواکر بھیجئے۔

حالات کا تقاضہ جلد از جلد عمل کا طالب ہے۔ کوئی عملی پروگرام طے کر کے اس پتہ پر رابطہ پیدا کریں۔

کنوینر پیام انسانیت فورم

پوسٹ بکس ۹۳، ندوہ۔ لکھنؤ (۲۲۶۰۰۷) فون نمبر ۴۲۹۴۸ / ۴۹۰۴۷

قسط ۳

دس دن ـــــ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں

اسحٰق جلیس ندوی

★

ننگی دشوار گذار پہاڑیوں پر واقع ایک بستی ہے، یہاں تک پہونچنے کے لیے سوائے ان ٹرک کے جو پہاڑی جنگلات سے لکڑیاں ڈھوتے ہیں، کوئی اور سواری کام نہیں آتی۔ ہم اپنی جیپ چھوڑ کر ٹرک میں سوار ہوئے، اس پہاڑی راستے پر ہر ٹرک ڈرائیور گاڑی نہیں چلا سکتا، ہر قدم پر دشوار گذار موڑ اور کھائیاں، ہر لمحہ کسی حادثہ کا اندیشہ، خدا خدا کرکے یہ راستہ طے ہوا، اکا دکا انسانی صورتیں نظر آئیں اب ہم بستی میں داخل ہو گئے، قیام ایک دینی مدرسہ میں تھا، جو اپنے سلیقہ اور صفائی، مہمانوں کی ایک ایک ضرورت اور سہولت کے اہتمام کے لحاظ سے بہت ممتاز محسوس ہوا، اس مدرسہ کے مہتمم مولوی ہیر دین صاحب کی سادگی، خلوص، محنت و جانفشانی، تواضع اور مہمان نوازی نے ہم سب کو متاثر کیا۔ یہاں لوگوں سے معلوم ہوا کہ اس دشوار گذار مقام پر حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری اور کئی بزرگان دین اور علمائے کرام تشریف لا چکے ہیں، انہیں نفوس قدسیہ کی انفاس طیبہ کی برکت تھی کہ یہاں بہت جی لگا، تمام ساتھی اپنی نماز اور دعا، کی کیفیات کا ذکر کرتے رہے۔ عشاء بعد جلسہ ہوا، تلاوت قرآن مجید کے بعد مولوی ظریف صاحب قاسمی نے تعارفی تقریر کی، انکے بعد مولوی مصطفےٰ رفاعی ندوی نے بیان کیا، بعد مولانا کا خطاب ہوا، آپ نے قرآن مجید کی اس آیت

کی تلاوت کی " یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ (اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو جب اللہ کا رسول تم کو ایسی چیز کی طرف بلائے جو تم کو زندہ کرنے والی ہو اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے) اللہ تعالیٰ زندہ انسانوں کو ایسی چیز کی طرف بلا رہا ہے جو ان کو زندگی بخشنے والی ہے، یہ خطاب زندوں سے ہے، مُردوں سے نہیں، مُردے تو سن ہی نہیں سکتے اور سُنیں تو فائدہ نہیں اٹھا سکتے ــ اللہ تعالیٰ زندگی کی دعوت ان لوگوں کو دے رہا ہے جو چلتے پھرتے، بڑی بڑی لڑائیاں لڑتے، کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرتے، اور صنعت و حرفت اور کمالات کا لوہا منواتے ہیں ــ تو کیا ہم زندہ نہیں۔ ؟ وہ کون سی زندگی ہے جس کی دعوت زندہ انسانوں کو دی جا رہی ہے؟

بھائیو! ہم آپ سب جانتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے بنا ہے، ایک تو اس کا گوشت پوست کا ظاہری جسم، وہ ڈھانچہ، سانچہ یا لفافہ جس کو ہم جسم کہتے ہیں، بدن کہتے ہیں۔

اور دوسری چیز ہے اس کی روح۔ انسان کی روح پر اس کے جسم کا مدار ہے۔ روح نکل جائے تو جسم بیکار ہے۔ کسی عزیز سے عزیز انسان کی روح نکل جائے تو ہم چار چھ گھنٹے میں اس جسم کو سپرد خاک کر دیتے ہیں۔ دنیا میں ہمارے جو کچھ تعلقات ہیں وہ روح کی بدولت ہیں۔ اگر جسم میں روح رہے گی تو یہ جسم نہ سڑے گا نہ گلے گا، جسم پھلتا پھولتا ترقی کرتا رہے گا۔ ولی، قطب، غوث، ابدال، بادشاہ، وزیر، صدر جمہوریہ، رستم زماں، عالم، دولت مند اور صوفی بن جائے گا جب تک روح ہے انسان سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جب روح نے ساتھ چھوڑ دیا تو ترقی رک

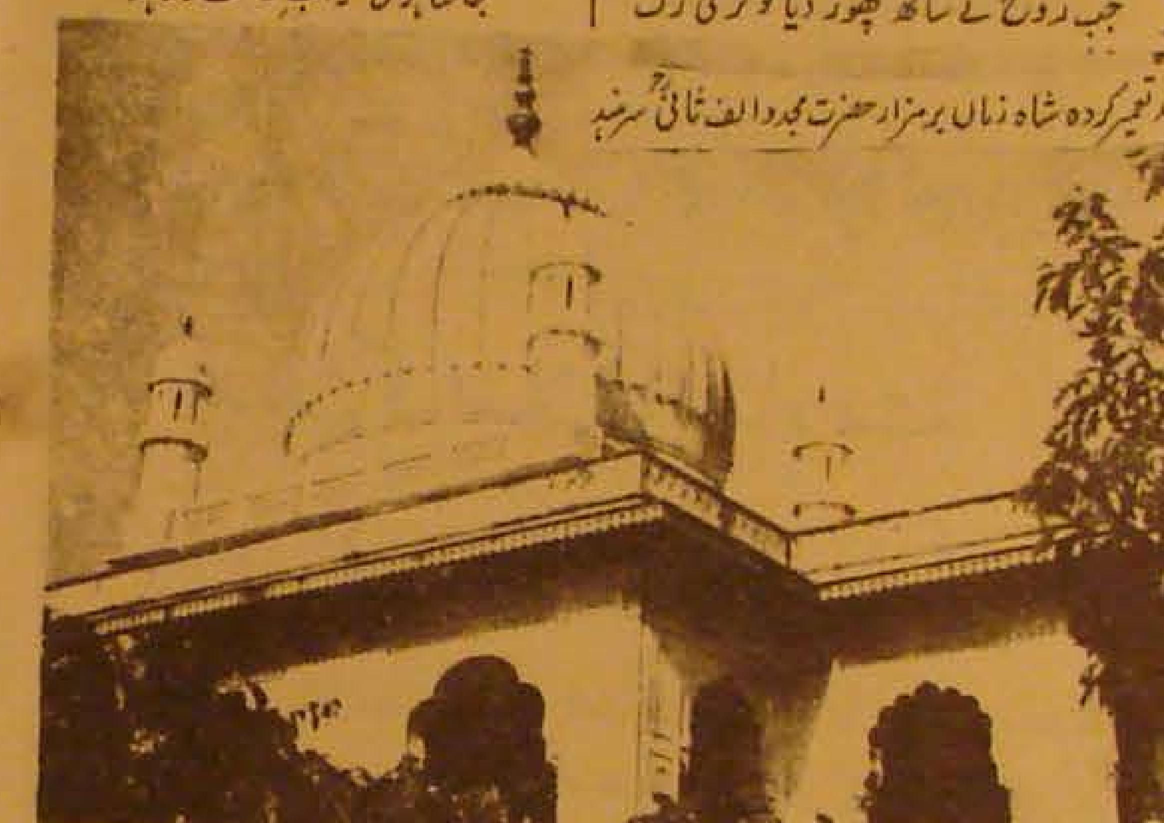

گنبد تعمیر کردہ شاہ زماں بر مزار حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہند

گئی اور بگاڑ پیدا ہو گیا، زوال طاری ہو گیا۔

بھائیو! جس طرح جسم کے لئے روح ضروری ہے اسی طرح روح کے لیے بھی ایک روح ضروری ہے۔ وہ روح کیا ہے۔ ؟ وہ ہے اللہ تعالیٰ کے احکام۔ اللہ کے رسولؐ کی تعلیمات، اللہ تعالیٰ سے زندہ تعلق، اعلیٰ اخلاق و صفات، اللہ تعالیٰ سے ایسا رابطہ جیسا بلب کے تاروں کا پاور ہاؤس سے ہوتا ہے۔ روح کی یہ "روح" روحانی زندگی کی علامت ہے اور یہی مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ اسی روحانی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔

دن میں پانچ مرتبہ اذان دی جاتی ہے، یہ اسی زندگی کو سنوارنے، بنانے اچھے عمل اختیار کرنے اور غلط کام چھوڑنے کی دعوت ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات اور اللہ کے رسولؐ کے ارشادات اور دین و شریعت کا پورا نظام اسی زندگی کو پیدا کرنے اور اپنانے کی دعوت ہے جس سے غفلت کا نتیجہ ملت کی زبوں حالی اور پستی اور پوری دنیائے انسانیت کی ابتری اور بربادی کی شکل میں ہمیں نظر آ رہا ہے۔

واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ۔ یاد رکھو جس کو تم اپنا دل کہتے ہو یہ تمہارے اختیار میں نہیں، یہ دل تمہارے پہلو میں، تمہارے سینے میں ہے لیکن اس پر ہماری حکومت ہے، یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے، آڑ بن جاتا ہے، شاعر نے کہا تھا ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جانتے ہیں کہ ثواب میں کیا فائدہ ہے، گناہ میں کیا نقصان ہے، نماز پڑھنا جانتے ہیں، لیکن مسجد کی طرف قدم نہیں اٹھتا، دل نہیں اٹھتا، ہزار بہانے بناتا، ہزار مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دل کے گھمنڈ میں نہ رہنا، اس دھوکہ میں نہ رہنا کہ دل تو ہمارا ہے جب چاہیں گے کر لیں گے۔ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ آگے کی آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ "تم اسی کے پاس جاؤ گے، وہاں تم کو جمع ہونا ہے اور حساب دینا ہے۔"

مولانا محترم کے بیان کے بعد حاجی عبد الکریم صاحب پاریکھ کی مفصل تقریر ہوئی جسے سامعین نے بڑی دلچسپی سے سُنا۔

داخلی دروازہ خانقاہ مجددیہ سرہند

پہاڑوں پر آباد اس بستی میں شب گذار کر ہمارا قافلہ صبح خضر آباد روانہ ہوا، جہاں نماز جمعہ کے بعد بڑے پیمانے پر ایک جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا، خضر آباد سے قریب مسلمانوں کی ایک بستی میں ہم پہونچے، یہاں غسل اور کھانے سے فارغ ہو کر، اذان جمعہ سے پہلے پہلے ہم لوگ خضر آباد کی وسیع جامع مسجد میں تھے، جہاں دور دور کے علاقوں سے نماز جمعہ اور جلسے کے لیے آئے ہوئے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ نماز سے پہلے مولوی الیاس صاحب قاسمی نے تعارفی تقریر کی، اس کے بعد مولانا مدظلہ نے خطاب فرمایا۔ اس قصبہ کے غیر مسلموں کو چونکہ بعد نماز جمعہ جلسے کی دعوت دی گئی تھی، لہٰذا نماز بعد مسجد کے صحن میں پُر اشتیاق سامعین جمع ہو گئے۔ مسجد کے بیرونی صحن میں غیر مسلم بھائیوں کے لیے کرسیوں کا نظم کیا گیا تھا، اس موقع پر عبد الکریم صاحب پاریکھ اور راقم سطور نے تقریر کی اور تحریک پیام انسانیت کی اصل غرض و غایت کا تعارف کرایا اور اخوت و بھائی چارگی کا پیام دیا۔ اس کے جواب میں ایک غیر مسلم رہنما نے جو علم و ادب کا بھی ذوق رکھتے ہیں، بڑی اچھی تقریر کی انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ "۱۹۴۷ء کے خونیں ہنگاموں میں جب مسلمان یہاں سے ترک وطن کر رہے تھے تو میرے جیسے لوگوں کو یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کا چمن اور ہمارا یہ گلستاں اس خوبصورت پھول سے محروم نہ ہو جائے جسے مسلمان کہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ پھول اس چمن میں باقی ہے اور اس کی مہک سے جیسا ہم اس وقت فائدہ اٹھا رہے ہیں، ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔"

ان غیر مسلم معزز شخصیت کی پُر خلوص تقریر کا اثر تھا کہ حضرت مولانا دوبارہ تشریف لائے اور انہوں نے بڑی مفصل تقریر فرمائی

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر

اس پروگرام کے فوراً بعد ہمیں سرہند روانہ ہونا تھا، پنجاب اور ہریانہ کے دورے میں۔ یہ

"وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں"

یعنی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے مسکن، مرکز اور مرقد پر حاضری ہمارے پروگرام کا اہم حصہ تھی۔ خضر آباد سے جمنا نگر روانہ ہوئے۔ ریلوے اسٹیشن سے سرہند کے لئے ٹرینوں کا ٹائم معلوم کیا، لیکن اس وقت کوئی مناسب گاڑی نہیں تھی، علی الصبح ایک ایکسپریس ٹرین تھی، اس سے روانگی کا فیصلہ ہوا، نماز مغرب و عشاء نیز شب میں قیام کے لئے جمنا نگر (جگادھری) کی عظیم الشان جامع مسجد کا انتخاب عمل میں آیا، مسجد پہونچے تو وہاں کے امام صاحب اور مصلیان بڑے تپاک سے ملے اطراف کے مسلمان اور غیر مسلم بھائیوں میں خبر عام ہو گئی، کئی حضرات ملنے آئے، اور ان کا اصرار رہا کہ عشاء کی نماز کے بعد اپنے بیان سے یہاں کے لوگوں کو بھی مستفید فرمائیں، مولانا نے ان کی درخواست منظور فرمائی، عشاء بعد ایک مقامی سکھ افسر سردار جسونت سنگھ کی صدارت میں جلسہ ہوا جس میں مولانا نے خطاب فرمایا۔ صدر جلسہ نے تحریک پیام انسانیت کے سلسلے میں اپنے اور اپنی قوم کی طرف سے گہری دلچسپی، اچھے تاثر اور بھرپور تعاون کا اظہار کیا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق صبح صادق سے پہلے ریلوے اسٹیشن روانہ ہوئے، نماز صبح پلیٹ فارم پر ادا کی، جامع مسجد کے امام صاحب اور کئی حضرات اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے، ٹرین آئی آسانی سے جگہ مل گئی، سرہند اسٹیشن پہونچ کر وہاں سے بس کے ذریعہ خانقاہ مجددیہ حاضر ہوئے۔ بلند اور وسیع داخلی دروازے پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر جلی حروف میں "خانقاہ عالیہ مجددیہ" تحریر تھا، یہیں پر درگاہ متوسلین میں سے ایک بزرگ صورت شخص نے گرمجوشی سے ہمارے قافلہ کا استقبال کیا اور ہمارا سامان اٹھوا کر بارہ دری کے کشادہ کمرے میں پہونچایا، جہاں ہر طرح سہولت تھی، تھوڑی دیر میں درگاہ کے سجادہ نشین اور ان کے ایک عزیز تشریف لے آئے، دیر تک گفتگو رہی، حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ العالی کی آمد کے موقع پر کے حالات و تاثرات وہ سناتے رہے، اس عرصہ میں تمام رفقاء تیار ہو گئے اور ہم سب مسجد اور مزار کی طرف روانہ ہوئے، خانقاہ مجددیہ کی چار دیواری میں ہندوستان کی تاریخ کا وہ باب نگاہوں کے سامنے بار بار آتا رہا، جب اس ملک میں ایک مطلق العنان بادشاہ نے دین اکبری کا فتنہ اٹھایا تھا جب پورے ملک میں اسلام مظلوم اور اسلامی شعائر تحقیر و استہزاء کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اس وقت اسی سرزمین سے ایک قلندر نے اس فتنہ کے سدباب اور گمراہی کے سیلاب کے رخ کو موڑنے میں ایسا عظیم الشان اور محیر العقول کارنامہ انجام دیا جس پر اسلامی تاریخ تا ابد فخر کر سکتی ہے، مزار پر پہونچے تو سکون و طمانیت کی ایک چادر کھنچی ہوئی محسوس ہوئی، پورا ماحول سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے اخفاء اور سکینت کا مظہر تھا، مولانا مدظلہ اور تمام رفقاء دیر تک تلاوت ایصال ثواب اور مراقبہ میں مشغول رہے، یہاں حاضری کے بعد اقبالؒ کے ان اشعار کی قدر و قیمت دل و نگاہ میں اور بڑھ گئی ؎

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
جس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
جس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

واپسی میں حضرت شاہ محمد معصومؒ، حضرت شیخ سیف الدینؒ، حضرت شیخ محمد صادقؒ، حضرت شیخ محمد سعیدؒ کے مزارات پر حاضر ہوئے اور ایصال ثواب کیا۔ ان حضرات نے حضرت مجددؒ

مسجد و مزار حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہند

مزار حضرت شاہ محمد معصومؒ

مزار حضرت شیخ سیف الدینؒ

صاحبؒ کے مشن کو برابر جاری رکھا، اور حکومت و معاشرہ میں صحیح اسلامی فکر اور شریعت کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سلسلۂ مجددیہ سے افغانستان کے حکمرانوں اور عوام کو خصوصی تعلق رہا ہے، اسی کے آثار یہاں کے چپہ چپہ پر عیاں ہیں، افغانستان کی کئی ممتاز شخصیتیں یہاں مدفون ہیں۔

کمرہ میں واپسی کے بعد کھانا کھایا گیا، خانقاہ میں آنے والوں کے قیام و طعام کا باقاعدہ نظم خانقاہ کی طرف سے ہوتا ہے، بنگال کشمیر اور مختلف مقامات کے زائرین مقیم تھے، خانقاہ کی طرف سے دیا جانے والا کھانا بہت سادہ مگر بڑا لذیذ تھا،

تاریخ دعوت و عزیمت کی

چوتھی جلد کا آغاز:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" اسلامی تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز اضافہ ہے۔ اس کتاب کے اب تک تین حصے شائع ہو چکے ہیں، مولانا کے پیش نظر پہلی صدی ہجری سے لے کر اس صدی تک کے ان صاحبان دعوت و عزیمت کی خدمات اور نمایاں کارناموں کا تذکرہ ہے جنہوں نے وقتاً فوقتاً اسلامی تاریخ کے نازک ترین موڑ پر دین و شریعت کی اصل و اساس کی حفاظت اور ملت کے سواد اعظم کو دین سے منحرف ہونے سے محفوظ رکھنے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ تاریخ دعوت و عزیمت کا چوتھا حصہ (جو مکمل طور پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات و دینی خدمات پر مشتمل ہوگا) مصنف کی سفر و حضر کی مصروفیات کی وجہ سے ابھی تک صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں ہو سکا — سرہند حاضری کے بعد اس نیک ارادے کے عملی آغاز کا داعیہ پیدا ہونا فطری تھا،

حضرت مولانا مدظلہ، اور راقم سطور نے حضرت مجدد صاحبؒ کی مسجد میں، دو دو رکعت نفل پڑھ کر دعا کی اور وہیں مولانا نے تاریخ دعوت و عزیمت کی چوتھی جلد کا پیش لفظ لکھوایا، راقم سطور کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ حضرت مولانا املا کرا رہے تھے اور میں اسے قلمبند کر رہا تھا،

سرہند میں گذشتہ شب قیام کرنا تھا، لیکن بروقت کوئی سواری نہ ملنے کی وجہ سے آج صبح حاضری ہوئی۔ آج شب میں مالیرکوٹلہ میں جلسۂ عام تھا، مالیرکوٹلہ کے داعی صوفی اسمٰعیل صاحب، انکے صاحبزادے، دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم مالیرکوٹلہ کے دو طلبہ اور چند حضرات ہمارے قافلہ کی رہنمائی کے لئے مالیرکوٹلہ سے سرہند پہونچ گئے تھے، عصر کی نماز اول وقت میں پڑھ کر ہمیں مالیرکوٹلہ روانہ ہونا تھا۔

(جاری)

مرکزِ نور و تجلّی ہے دیارِ سرہند

غلام صابر قدیری سندیلوی - پاٹا نالہ لکھنؤ

مرکزِ نور و تجلّی ہے دیارِ سرہند
غوث و ابدال زماں یعنی مشاہیر جہاں
صبح بھی نور فشاں شام بھی نکہت افروز
روضۂ حضرت معصومؒ کا اللہ رے جمال
لحن دلکش میں وہ قرآں کی تلاوت کا سماں
فتنۂ دین الٰہی ہوا پامال و تباہ
شاہِ سرہند نے فرمایا تصور اس کا صاف
یہ حجاباتِ من و تو نہ رہیں گے حائل
وصفِ سرہند سے قاصر ہے زباں تو میری

واہ کیا شان ہے کیا عز و وقارِ سرہند
تجھ میں آسودہ ہیں اے خاکِ دیارِ سرہند
نور و نکہت سے ہیں پُر لیل و نہارِ سرہند
جانِ نظارہ ہے یہ جانِ بہارِ سرہند
وقتِ صبح دیکھے کوئی حُسنِ بہارِ سرہند
دشمنِ دینِ محمد ہوا خوارِ سرہند
اور جہانگیر ہوا دل سے نثارِ سرہند
عشق میں ہو تو کوئی سینہ فگارِ سرہند
چشم پُرنم ہیں مگر آئینہ دارِ سرہند

میں تو دیوانۂ سرہند ہوں مجھ کو صابر
اور کیا چاہیئے جز کوچۂ یارِ سرہند

غزل

(سید اطہر حسین اطہر)

بہارِ حُسن جو پیشِ نظر ہے کیا کہنا
اِدھر ہے کیف تو جلوہ اُدھر ہے کیا کہنا

نہیں وہ سامنے لیکن ہے اک تصورِ حُسن
محیطِ ذہن جو آٹھوں پہر ہے کیا کہنا

نظر نظر جسے ڈھونڈو تو کچھ پتہ نہ چلے
قدم قدم وہ مراہم سفر ہے کیا کہنا

وہ جس کی تابشِ رُخ سے ہے یہ نمودِ حیات
مری نگاہوں میں ایسا بشر ہے کیا کہنا

فرازِ عرش سے آتی ہے جو صدا دل میں
نشاطِ روح و سرورِ جگر ہے کیا کہنا

تجلّیوں سے تری ماند ہیں مہ و انجم
یہ ماہیت تری قلبِ بشر ہے کیا کہنا

دلِ شکستہ کو تابندگی عنایت کی
مگر کسی کو کب اسکی خبر ہے کیا کہنا

ہو کوئی آئینہ آتے ہو تم نظر مجھ کو
یہ انتہائے فریبِ نظر ہے کیا کہنا

وہ جس نے زیست کو تجھ پر نثار کر ڈالا
وفا اُسی کی محلِّ نظر ہے کیا کہنا

جہاں پہ لاکے زمانے کو میں نے چھوڑا تھا
رُکا ہوا وہ اُسی موڑ پر ہے کیا کہنا

دلِ حزیں، ہے بظاہر جو اتنا بے پروا
یہ بے خبر بھی بڑا باخبر ہے کیا کہنا

خبر نہ رکھتا تھا شام و سحر کی جو اطہر
وہ اور گردشِ شام و سحر ہے کیا کہنا

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ہنوز گیسوئے دجلہ و فرات
(اقبالؒ)

یہ خط آرم اسٹرانگ کے قبول اسلام سے پہلے لکھا گیا ہے۔ آرم اسٹرانگ کے اسلام لانے کی خبر گذشتہ دنوں اخبارات میں آچکی ہے

چاند کے پہلے مسافر آرم اسٹرانگ کے نام کھلا خط

(از عبد اللہ جامعی مدنی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

جناب آرم اسٹرانگ صاحب

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

آپ سے کسی ایسے انسانی، ارضی یا علمی رشتہ بنانے یا بتانے کی ضرورت نہیں آج آپ دنیا میں ایسے ہی مشہور ہیں جیسا کہ چاند دنیا میں مشہور ہے اور جس وقت آدمی کی نظر چاند کی طرف جاتی ہے آپ اس کے اندر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں آپ کو چاند پر جانے کی بھی مبارکباد دیتا ہوں اور وہاں سے مع الخیر واپس آجانے کی بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایسا شرف ہے جو آجتک کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا اور نہ آج کے بعد کسی کو حاصل ہوگا چاہے دنیا سورج کے احاطہ سے نکل کر کہکشانوں میں پہنچ جائے اور چاہے پانچ سو ضرب پانچ سو کھرب کہکشانوں کو پار کر کے آسمانوں تک ہی پہنچ جائے اس لیے کہ خلا کی سب سے پہلی منزل پر قدم رکھ کر آپ نے جو سبقت حاصل کی ہے آپ کے بعد کسی کو نہیں مل سکتی آپ کے بعد جو بھی آئے گا اور جہاں تک بھی جائے گا آپ ہی کی عملی عزمی ذریت کہلائے گا۔ جس طرح ہزاروں یا لاکھوں سال گذرنے کے بعد بھی ہر آدمی آدم کی اولاد کہلاتا ہے صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔ چاہے وہ اپنی عقل و فکر اور حشمت و عظمت میں کتنا ہی آگے نکل جائے۔ ایک مغالطہ اور فریب بھی صاف کر دوں۔ میں نے کہا کہ چاہے کہکشانوں کو پار کر کے آسمانوں تک پہنچ جائے۔ آپ فرمائیں گے کہ کیا تب آسمان نہیں ہے جہاں ہم ہو کر آئے اور جہاں مستقبل قریب میں جانے کا ارادہ ہے۔ جی ہاں یہ آسمان نہیں ہے ہمارے عقیدہ کے مطابق آسمانوں کی ابتدا تاروں کی کائنات کے بعد شروع ہوتی ہے یہ تو سب اس کے مقدمات ہیں اور وہاں تک جانے کے راستہ کی قندیلیں۔ اصل آسمان کی چھت کو کوئی انسان پار ہی نہیں کر سکتا۔

اب مجھے آپ سے بہت ضروری بات عرض کرنی ہے آپ اس وقت دنیا میں مشہور بھی ہیں، معزز بھی ہیں اور خاص طور پر علمی دنیا کے لیے محبوب بھی۔ ہیروز سے محبت کرنا انسان کی فطرت ہے۔ اب تک جتنے بھی ہیروز ہوئے ہیں وہ قومی، ملکی یا مذہبی ہوتے تھے مگر آپ عالمی ہیرو ہیں اور آپ سے پہلے کوئی عالمی ہیرو نہیں پیدا ہوا جس کو بلا تفریق مذہب و ملت و قوم اسی کی زندگی میں تسلیم کر لیا گیا ہو یہ بھی آپ کا ایک خاص شرف ہے بلکہ میں کہوں گا اس وقت دنیا میں صرف آپ کی ذات ایک نقطہ ہے جس پر سارا عالم جمع ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح چاند جامع الانظار ہے آپ جامع الافکار ہیں چاند سے دنیا محبت ہی کرتی ہے دشمنی کوئی نہیں رکھتا۔ یہی کیفیت آج زمانہ میں آپ کی بھی ہو گئی ہے اس امتیاز خاص پر بھی اس حقیر کی مبارکباد قبول فرمائیں اس پر میرا ایک سوال ہے آپ نے کائنات کو جتنے قریب سے دیکھا ہے یا جتنی دور تک جا کر دیکھا ہے ہم نے نہیں دیکھا ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ علم الیقین ہے مگر آپ کے پاس عین الیقین۔ مگر جو لوگ اس بات کو جھٹلا رہے ہیں اور ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں اس دوربینی اور سکی و برقی دور میں۔ وہ کہتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے چاند پر کوئی نہیں پہنچا کہیں کسی پہاڑ وغیرہ پر ہو کر چلے آئے ہیں۔ آپ اس بات پر ہنسیں گے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ مگر میرا یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر اس حقیقت کے قائل ہو جائیں گے۔ لیکن مسٹر آرم صاحب میں پوچھتا ہوں اگر کوئی اس کے باوجود بھی اس کا قائل نہ ہوا سے ضد ہو گئی، ہٹ ہو گئی اپنی اڑ پر قائم ہے۔ میرا خیال ہے آپ کا جواب آئے گا کہ بہر حال وہ قابل رحم ہے اور کچھ دن زیادہ اسی ہٹ پر قائم رہا تو خود ہی پاگل مشہور ہو جائیگا اس طرح اس کے وجود سے اس وقت کسی کا کوئی نقصان نہیں۔

لیکن اگر اس کو کسی ریاست کا صدر بنا دیا جائے، کروڑوں جانداروں کا نظام اس کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔ تب میرا خیال ہے آپ یہی فرمائیں گے کہ اول تو ایسا ہو نہیں سکتا۔ دنیا ہزار پاگل ہو گئی ہو مگر پھر بھی ایسے پاگل کو کوئی صدر نہیں بنا سکتا اور اگر کوئی صورت ایسی بن سکتی ہو کہ وہ صدر بن جائے تو میری رائے ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ صدارت کی کرسی پر آئے جیل میں ڈالدینا چاہیے اس لیے کہ اگر کوئی آدمی ایسا پاگل ہے جو چاند کے سفر کو فسانہ سمجھ رہا ہے تو اس بے عقلی کے ہزاروں شعبے اور نکل سکتے ہیں اگر اقتدار اس کو مل گیا تو دنیا کو پتہ نہیں کس پریشانی میں ڈال دے۔ میں نے یہ جوابات آپ کی بجائے اپنی طرف سے دیدیے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ خود دیتے تو اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔ کہاں دیدہ کہاں شنیدہ، کہاں ثابت کہاں سیارہ لیکن آپ کی طبیعت کا ایک اندازہ رکھتے ہوئے سمجھتا ہوں کہ مفہوم کچھ زیادہ جدا نہ ہوتا اور اس آدمی کے پاگل ہونے پر ہم دونوں ہی اپنے آپ کو متفق پاتے لیکن آرم اسٹرانگ صاحب اس آدمی کے پاگل پن کی کیا حد ہو گی جو اس ساری کائنات کو دیکھتا ہے اور اس کے بنانے والے کو نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود بن گیا ہے اس کا بنانے والا کوئی نہیں ہے گویا وہ خود بھی خود بخود پیدا ہو گیا ہے اس کی کوئی ماں تھی نہ باپ۔ اور جناب مسٹر آرم صاحب اگر یہ شخص اس گمراہی کی تبلیغ بھی شروع کر دے اور ساری سوسائٹی کا عقیدہ بھی بگاڑ دے اور پھر سوئے اتفاق کہ اس کو ایک بڑی ریاست کا اقتدار بھی سونپ دیا جائے ایسے آدمی کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سیاسی مصالح کی بنا پر آپ اس بات کا جواب صراحت سے نہ دیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں آپ کی خاموشی بھی ہمارے لیے جواب ہے اس میں سب کچھ مل جائے گا۔ اس لیے کہ خیر سے آپ خدا کے ماننے والوں میں ہیں اس سے انکاری نہیں ہیں بلکہ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ رسول کو بھی مانتے ہیں یعنی آپ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ یہ بے پایاں کائنات ایک فعل عبث نہیں ہے، تخلیق کائنات کی بھی کوئی غرض ہے اور انسان کی پیدائش کی بھی کوئی غرض ہے اس لیے کہ رسول اسی غرض کو بتانے کے لیے آتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے آپ کے نبی ویسے ہی ہمارے بھی نبی ہیں۔ ہم جس طرح اپنے نبی کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیتے ہیں اسی طرح آپ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام نامی پورے ادب و احترام کے ساتھ، اور یہ محض شوق اور محبت کی بات نہیں۔ یہ بات ہم پر فرض کی گئی ہے، ہمیں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ میں نبی بھیجے ہیں۔ انسانوں کی ہدایت کے لیے سیکڑوں ہزاروں لاکھوں۔ ان میں سے بعض کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہی سب سے قریبی رشتہ ہے جو ہمارے اور آپ کے درمیان قائم ہے مگر اسی سلسلہ میں ایک بات عرض کرنی ہے آپ تو تحقیق و تدقیق کے آدمی ٹھہرے اور فلکیات دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ عقلمند اور زیادہ ہمت ور۔ ہمارے یہاں مشہور ہے کہ آپ

لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو شامل کرکے ایک کے بجائے تین تین خداؤں کے قائل ہیں۔ آپ کائنات کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر رہے ہیں آپ کی آنکھ اس وقت ظاہر اور مظاہر سے زیادہ دیکھ رہی ہوگی۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا حکمت سے مملو نظام کائنات صرف ایک خدا کی گواہی نہیں دے رہا ہے؟ ایک تو نظام کی تنظیم و ترتیب، اور تنسیق و توحید کا طبعی تقاضا اس بات کا مدعی ہے کہ گورننگ طاقت کوئی ایک ہی ہونی چاہئے علاوہ ازیں وہ خدا جو اس بے پناہ کائنات کا خدا ہے کیا وہ اپنی طاقت اور قوت کے اعتبار سے انڈیپنڈنٹ ہونے کے قابل نہیں ہے؟ وہ آپ اپنی مہمات کی کاربرآری میں کسی وقت کسی اعتبار سے کسی شریک سہیم ساتھی اور رفیق کار کا محتاج بھی ہو سکتا ہے؟ مسٹر آرم صاحب اگر ایسی بات ہے تو یقین جانئے کہ وہ خدا نہیں ہو سکتا اور نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ ایسے خدا کے قائل ہو سکتے ہیں یا کوئی بھی سمجھدار ایسے وجود کو خدا مان سکتا ہے جس میں محتاجی اور دست نگری کا جز بھی شامل ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا میرا جہاں تک خیال ہے بیٹے کی بات تو کبھی کنایۃً یا استعارۃً کہی گئی ہوگی خدا رحیم ہے کریم ہے شفیق ہے وہی رزق دیتا ہے وہی تربیت کرتا ہے اس لیے بیشک وہ ساری مخلوق کا باپ ہے اس شرط شدید کے ساتھ کہ تولید و تناسل کے عیب سے اس کی ذات پاک ہے تولید و تناسل کی صفت تو پھر ایک دوسری محتاجی کی دلیل بن جاتی ہے آپ کہتے ہیں کہ اس نے لفظ "کن" سے پیدا کیا ہے تو "کن" سے ساری کائنات ہی پیدا ہوئی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سب سے بڑی صفت اور ان کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اللہ نے ان کو ایک بہت بڑے زمانہ کے لیے پیغمبر مقرر کیا تھا اسی طرح حضرت روح القدس کا قصہ ہے وہ فرشتے ہیں فرشتوں کے سردار، بڑے عالی مرتبت ہیں، صاحب مقام ہیں لیکن بہرحال مخلوق ہیں، محکوم ہیں، مامور ہیں، محتاج ہیں، ہم خدا کو خدا کہتے ہیں اس لیے کہ وہ ساری دنیا کی حاجات کو پوری کرتا ہے مگر خود کسی کا کسی حال میں کسی اعتبار سے محتاج نہیں ہے۔ بے نیازی میں اس کی شان کی جو بلندی ہے وہ شراکت میں نہیں رہتی معقول بھی ہے کہ خدا کو خدا کا درجہ دیا جائے رسول کو رسول کا اور فرشتہ کو فرشتہ کا۔ ع

اگر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

غرض کہ میرا پہلا مقدمہ تو یہی ہے کہ جب آپ نے خدا کو پا لیا ہے تو اب آپ تھوڑا بہت وقت نکال کر اس کی صفات میں غور فرمائیں تاکہ خدا کو آپ پاک تر اور اعلیٰ تر اور عمدہ تر تصور کے ساتھ بھی دیکھ سکیں یہ ایسی ہی تحقیق ہوگی جیسے آپ نے چاند کو دیکھ کر زمین کے اعلیٰ تر ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ کے رسول کی رسالت میں تو کوئی کلام نہیں وہ ایسے ہی مقدس ہیں جیسے خود ہمارے رسول۔ لیکن آپ کی کتاب (انجیل) بیشک آپ کی نظر ثانی کی محتاج ہے تحقیق کر لی جائے کہ وہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کیوں نہیں لکھی گئی اور بعد میں لکھی گئی تو پھر وفات کے قریب ترین عہد میں کیوں نہیں مرتب کی گئی؟ یہاں تک کہ جب لکھی گئیں تو بیشتر کتابیں بن گئیں اور پھر جب یہ چھانٹی گئیں تو ۷۰ میں سے صرف چار رہ گئیں۔ ۶۶ کہاں گئیں۔ یہ الفاظ شرف صرف متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی کتابوں کو کیوں حاصل ہوا؟ یہ باتیں جناب کو خود تحقیق کرنی چاہئیں، تاکہ دنیا کا اعتراض ختم ہو سکے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل انجیل آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے اور اگر آپ خود بھی اسی نتیجہ پر پہنچیں تو پھر آپ کو چاند سے زیادہ طویل ایک اور سفر کرنا ہوگا تاکہ آپ معلوم کر سکیں کہ الہامی کتابوں میں کون سی کتاب ہے جس کو آپ انجیل کے مقابلہ میں صحیح تر پاک تر کامل تر اور محفوظ تر قرار دے سکیں۔ آپ اگر ہماری بات مانیں تو تاریخ کا محققین کا مستشرقین کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ یہ مقام صرف قرآن پاک کو حاصل ہے۔ ہاں ایک بات ہے کہ اس تجول میں آپ کو ایسی کتابیں بھی ملیں گی جو قرآن سے بھی زیادہ قریبی اور تاریخی کہی جا سکتی ہیں جن کے مصنفین کے انتقال کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے، اسی عہد کے لوگ تھے مثلاً ایران کا بہاء اللہ اور ہندوستان کا غلام احمد قادیانی۔ یہ لوگ بھی نبی ہونے کے دعویدار تھے۔ اس موقع پر آپ کیا کریں گے اب آپ کو نبی کا کوئی معیار قائم کرنا پڑے گا اور جیسا کہ دنیا کا یقین ہے کہ آپ ہی اس معیار سے اس کو جانچیں، اس کسوٹی پر اس کو کس کر دیکھیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، اس میں مشقت ضرور ہوگی مگر بات چاند کی طرح روشن ہو جائے گی۔ اور اگر آپ نے اس حقیقت کا دلیری کے ساتھ اعلان کر دیا **تو ایک زمانہ آئیگا کہ چاند سورج کی روشنی ختم ہو جائیگی اور آپ کی روشنی نہ صرف باقی رہے گی بلکہ بڑھتی ہی جائیگی۔**

آپ اجازت دیں تو اس معاملہ میں تھوڑی مدد آپ کی ہم کر سکتے ہیں اور نبی کا پہچانا گیا، اچھے اور برے اور ایک زیادہ اچھے اور زیادہ برے آدمی میں تمیز کرنی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عقلمند آدمی اس میں قاصر ہو سکتا ہے، اگر ان آدمیوں کی کتاب زندگی نظر کے سامنے کھلی ہوئی ہے میرا خیال ہے کہ قرآن پاک کے نبی کے بعد کے دعویداران نبوت میں سے تو کسی پر آپ کی نظر جم نہیں سکتی، ہمارا یقین ہے کہ لوٹ پھر کر نظر آپ کی ہمارے نبی کی طرف آئے گی لیکن پھر بھی ہمارا اصرار ہے کہ آپ تفحص سے کام فرمائیں اور جب ہمارے نبی کا نمبر آئے تو پھر پیدائش کے پہلے دن سے لے کر موت کے لمحہ تک ایک ایک دن کی تحقیق کرکے دیکھیں، بچپن دیکھیں، لڑکپن دیکھیں، جوانی دیکھیں، جوانی میں آ کر پھر آپ شادی دیکھیں، کاروبار دیکھیں، کاروبار کی امانت اور دیانتداری دیکھیں، قوم میں ان کا مقام دیکھیں، معاشرہ میں ان کی سچائی دیکھیں پھر نبوت کا آغاز دیکھیں، خود ان کی بیوی کی گواہی دیکھیں، قریب ترین دوستوں، قریب ترین خادموں کا سر تسلیم خم ہونا دیکھیں پھر کوہ صفا پر ساری قوم کی صداقت و امانت پر گواہی دینا دیکھیں، پھر اسی اپنی قوم کا دشمن ہونا دیکھیں، اور اس نازک زمانہ میں ان کی ثابت قدمی دیکھیں، پھر مددگاروں کی تلاش میں طائف کا سفر دیکھیں اور تذلیل و توہین کے ماحول اور ضرب و کرب کے میدان میں دشمن کے لیے دعائیں دیکھیں، پھر ایک جتھہ کو حبشہ کی طرف روانہ کرنا دیکھیں، اور وہاں شاہ حبشہ کی انصاف پروری اور پھر اس کا اسلام لانا دیکھیں، ادھر جناب نبی علیہ السلام کا مدینہ آنا دیکھیں اور پھر یہاں سیاسی زندگی کا آغاز دیکھیں، انجام دیکھیں، مزید شہادت کی ضرورت ہو تو حضور کے مکتوب گرامی کے جواب میں شاہ روم و شام ہرقلوس کا بیان دیکھیں۔ معاف فرمائیں میرا عریضہ طویل ہوتا جا رہا ہے لیکن جری اس لیے ہوں کہ آپ نے تو ۳۶ ہزار میل فی گھنٹہ بھی چلنا آتا ہے، اور حقیقت ہے کہ آپ ہی ہیں جس نے اب دنیا کے ذہن سے طوالت کا تصور ہی کھو دیا ہے اب تو ہزار لاکھ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک میل ہے۔ بہرحال اس حقیقت کے باوجود بھی معافی ضروری ہے کیونکہ اگر سرعت رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے تو وقت بھی اسی نسبت سے زیادہ قیمتی ہو گیا ہے۔ **لیکن میں جو بات کہہ رہا ہوں اگر آپ جیسے آدمی سے یہ بات دنیا کو پہنچ جائے تو دنیا کی قسمت ہی بدل جائیگی**

(باقی آئندہ)

پرنٹر، پبلشر، مسئول
سید محمد حسنی نے
جے۔ کے آفسیٹ پریس دہلی میں
طبع کرا کے دفتر "تعمیر حیات"
ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

پاکستان —— کیا دیکھا، کیسا پایا؟

اسحٰق جلیس ندوی

ذاتی ڈائری کے چند اوراق

قسط ۲

ظفر ندوی صاحب نے تازہ اخبارات "امروز"، "نوائے وقت"، "جنگ"، "جسارت" لا کر دیے، ان میں کل شب ۲۵ جون کو ریڈیو اور ٹی۔ وی سے نشر شدہ جنرل ضیاء الحق صاحب کی تقریر نمایاں تھی۔ پاکستان میں اردو صحافت نے بڑی ترقی کی ہے کتابت، طباعت گٹ اپ، مواد، ترتیب غرض ہر لحاظ سے معیاری۔ اخبارات کا سرسری مطالعہ جاری تھا کہ مولانا فضل قدیر صاحب ندوی تشریف لے آئے اور اپنا محبوب موضوع "ندوہ ماضی و حال"، انہوں نے چھیڑ دیا۔ تحریک ندوۃ العلماء سے ایسا تعلق اور مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ایسا جذباتی لگاؤ کہ جس کی مثالیں عام نہیں۔

لاہور سے کراچی کے لئے آج کا ریزرویشن نہیں ہو سکا تھا، کل ۲۷ جون کی تیزرو ایکسپریس سے ریزرویشن ہوا۔ لاہور میں ۲۴ گھنٹے کے قیام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند تاریخی مقامات دیکھنے اور معروف دینی و علمی شخصیتوں سے ملاقات کے لئے عصر بعد روانہ ہوئے۔

شاہی مسجد کے اطراف کئی لائق دید عمارتیں ہیں، شاہی قلعہ، مینار پاکستان، رنجیت سنگھ کا تخت، علامہ اقبال کا مزار۔ "مینار پاکستان" اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں مطالبۂ پاکستان کی تجویز منظور ہوئی تھی۔ یہ مینار فن تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے مینار کی بلندی پر چڑھنے کے لئے زینے بنے ہیں اطراف میں وہ ریزولیشن کندہ ہے جو مسلم لیگ کے اجلاس میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ مملکت کے مطالبہ پر منظور ہوا تھا، اس کے علاوہ مسٹر جناح کی تقریروں کے اقتباسات بھی درج ہیں۔

مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا، ہم شاہی مسجد پہنچے، دنیا کی وسیع ترین مسجد، جس میں چند سال پہلے اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کے موقعہ پر دنیائے اسلام کے سربراہوں نے نماز جمعہ ادا کی تھی، مینار پاکستان اور شاہی مسجد کا اطراف شام کے وقت تفریح کا بہت بڑا مرکز بن جاتا ہے خوبصورت پارکوں میں سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں کا ہجوم ٹولیوں کی شکل میں خوش گپیوں میں معروف۔ مغرب کی اذان ہوئی اور یہ دیکھ کر دل پر چوٹ لگی کہ نمازیوں کی تعداد پچاس سے بھی کم تھی۔ جس میں بیشتر مزدور پیشہ ع

کونسل میں ہیں سب سید مسجد میں فقط جمن

اسی شاہی مسجد کی چار دیواری میں وہ شاعر اسلامی مدفون ہے جس نے مسلمانوں کا نماز سے تعلق بیان کرتے ہوئے کہا تھا ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

آنکھیں یہ دیکھ کر حیران تھیں کہ معرکۂ جہاد و قتال کے موقع پر بھی نماز کی فرضیت کو فراموش نہ کرنے والے اسلاف کے جانشینوں کا امن و عافیت کی فضا میں صرف تفریح کی خاطر نماز کو ساقط کر دینا کس مستقبل کی علامت اور کس ذہنیت کا غماز ہے۔ اسلام کے نام پر اور اسلامی شریعت کے نفاذ کے ارادے سے قائم کی ہوئی اس مملکت میں دین کے ستون کا ایسا انہدام بڑی فکر و تشویش کی بات ہے، شاہی مسجد سے لاہور کے مرکزی ریلوے اسٹیشن کا نصف راستہ پیدل طے کیا۔ پرانے لاہور کی ایک جھلک اس طرح دیکھ لی۔

منگل ۲۷ جون ۱۹۷۸ء مطابق ۲۰ رجب المرجب ۱۳۹۸ھ

صبح کی نماز اپنی قیام گاہ سے قریب ایک مسجد میں ادا کی۔ جماعت ہو چکی تھی۔ ایک صاحب جو غالباً مسجد کے موذن یا امام ہوں گے، تلاوت قرآن میں مشغول تھے، پوری مسجد میں سناٹا تھا صد فیصد مسلم آبادی کے علاقہ کی مسجد میں نماز فجر کے بعد دو چار آدمیوں کو بھی ذکر اور تلاوت میں مشغول نہ پا کر ہندوستان کی مسجدوں کا موازنہ کرتے ہوئے جہاں صرف ۱۲ فیصد مسلمان آباد ہیں، دل نے حسرت اور افسوس کا ملا جلا تاثر محسوس کیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس مملکت خدا داد اور جمہوریۂ اسلامیہ میں معاشرہ میں دینی زندگی، حقیقی اسلامی روح اور تعلق مع اللہ کی محنت و کوشش میں بڑی کوتاہی بلکہ دینی اقدار کو حقیر و بے حقیقت ثابت کرنے کی منظم سازش ہوئی ہے۔

مولانا فضل قدیر ندوی کی مشفقانہ گفتگو اور ان کے صاحبزادے مولوی ظفر ندوی کی مہمان نوازی اور پذیرائی کے ماحول میں ناشتہ سے فارغ ہوئے۔ آج جامعہ اشرفیہ اور مختلف مقامات جانا تھا، قیام گاہ سے متصل سعودی کلچرل سنٹر ہے۔ یہاں جناب احمد حسنی صاحب سے ملاقات کی۔ احمد حسنی صاحب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قریبی عزیز اور غالباً ہم عمر ہیں۔ دونوں حضرات کی بے تکلف گفتگو سے سننے والے لطف محسوس کرتے ہیں۔ احمد حسنی صاحب حضرت مولانا سے "علی بھیا"، کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ باغ و بہار شخصیت، دلچسپ انداز گفتگو، عربی، انگریزی اور اردو پر یکساں قادر۔

شاہ فیصل شہیدؒ جب پاکستان تشریف لائے تھے تو احمد حسنی صاحب انکے ترجمان تھے اور بڑے کامیاب اور مقبول ترجمان۔ گلبرگ کا سرسبز علاقہ اور نہر کے کنارے کی شفاف سڑک سے پیدل ہی ہم لوگ جامعہ اشرفیہ پہونچے۔ دفتر اہتمام کے منتظم مولانا نے استقبال کیا۔ یہ دیوبند کے باشندے ہیں اور مولانا سالم صاحب کے برادر نسبتی۔ جامعہ اشرفیہ کا رقبہ، عمارتیں، حسن انتظام، فرنیچر، آرائش اور عظیم الشان مسجد کسی یونیورسٹی سے کم نہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ خلیفہ حضرت تھانویؒ کا قائم کردہ یہ دارالعلوم پاکستان کا ممتاز دینی تعلیمی مرکز ہے۔ یہاں پر مولانا عبدالمالک صاحب، خلف الصدق مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نیز دیگر کئی اساتذہ سے ملاقات و گفتگو رہی۔ کتب خانہ اور تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ دارالاساتذہ میں پرتکلف چائے پر اسٹاف کے کئی حضرات سے ملاقات ہوئی ملک کے حالات، اس ملک میں اسلام کے مستقبل اور ہندوستان میں دینی مدارس وغیرہ موضوعات پر دیر تک تبادلۂ خیال ہوا۔ ایک بجے ان حضرات کی محبت و خلوص کو سمیٹتے ہوئے ہم اچھرہ پہونچے ظہر کی نماز بعد مولانا مودودی سے ملاقات کا وقت طے تھا۔

ذیلدار پارک اچھرہ، عرصہ تک جماعت اسلامی کا مرکز، مولانا مودودی کی قیام گاہ، ماہنامہ ترجمان القرآن کا دفتر رہ چکا ہے۔ اب جماعت کا مرکز ملتان روڈ پر عظیم الشان عمارتوں سے آباد ایک نئی بستی "منصورہ"، منتقل ہو چکا ہے۔ البتہ مولانا مودودی کی قیام گاہ اور ماہنامہ ترجمان القرآن (جسے اب نعیم صدیقی صاحب مرتب کرتے ہیں) یہیں ہے۔ ہم ایسے وقت پہونچے جب نماز ظہر کی تیاری ہو رہی تھی۔ مودودی صاحب کے مطالعہ کے کمرے کے برآمدہ میں صفیں بچھ چکی تھیں۔ کنارے پر ایک کرسی رکھی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کرسی مولانا کے لئے ہے گھٹنوں اور جوڑوں میں درد کی وجہ سے مولانا بیٹھ کر نماز پڑھنے سے معذور ہیں۔ تھوڑی دیر میں مولانا مودودی لکڑی کے سہارے بمشکل کرسی تک پہونچے۔ مصافحہ ہوا، خیریت دریافت کی۔ نماز کے بعد اپنے ملاقاتی کمرے میں طلب کیا۔ ہم نے طبیعت کا حال اور موجودہ علمی مشاغل کے سلسلے میں دریافت کیا۔ تفصیل سے حال بتاتے رہے۔ سیرت کی کتاب کی تکمیل طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے رک گئی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم نے رخصت کی اجازت لی۔ اپنی قیام گاہ گلبرگ پہنچے دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا۔ اب روانگی کی تیاری شروع ہوئی۔ شام سات بجے ٹرین تھی، میزبانوں نے بڑے محبت و خلوص سے رخصت کیا۔ "تیز گام ایکسپریس" میں اپنی محفوظ نشست پر سامان رکھا، ٹرین چھوٹنے میں کچھ دیر تھی۔

اس عرصہ میں لاہور اسٹیشن کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس تاریخی مقام اور پاکستان کے دوسرے نمبر کی آبادی والے شہر کے ریلوے اسٹیشن کو ۱۹۴۷ء میں انگریز جس حال میں چھوڑ گئے تھے اس میں ایک اینٹ، ایک چھت کا بھی اضافہ گزشتہ تیس سال میں نہیں ہوا۔ پرانے ٹین کے شیڈ، رنگ و روغن اور صفائی اور سلیقہ سے محروم دیواریں اور پورا

ماحول۔ اس کا موازنہ ہندوستان سے کیجیے تو ہر جگہ کچھ نہ کچھ ترقی اور اضافہ نظر آئے گا۔
برتھ کا ریزرویشن تو ہو نہ سکا تھا، سیٹ ملی تھی، جس پر جاگتے اونگھتے شب گذری۔

بدھ ۔ ۲۸ جون ۱۹۷۸ء مطابق ۲۱ رجب المرجب ۹۸ھ

لاہور سے کراچی کا فاصلہ تقریباً ایک ہزار میل ہے، ٹرین کی رفتار اچھی ہے، پنجاب کے سرسبز خطے سے گذرتے ہوئے (لیکن ہندوستانی پنجاب کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور سرسبز و شاداب علاقہ کے مقابلہ میں پاکستانی پنجاب بہت کمتر محسوس ہوا) سندھ کے ریگستانی علاقہ تک ٹرین پہونچی، راستے میں کئی ایسے شہر آئے، جن کو قریب سے دیکھنا چاہیے تھا، بھاول پور، ملتان، حیدرآباد، سندھ وغیرہ۔

ٹرین چار بجے کراچی کے ڈرگ روڈ اسٹیشن پر پہونچی، یہاں سے ہمشیرہ کا مکان قریب ہے یہیں سامان اتارا۔ بہنوئی صاحب جو ہم سفر تھے، سواری کی تلاش میں روانہ ہوئے، لیکن یہ مسئلہ اس ملک کا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس پر افسوس رہا کہ اپنی آمد کی متعین تاریخ اور وقت کی اطلاع نہ دے سکے۔ خدا خدا کر کے ایک سواری ملی، گھر پہونچے، سب کو چشم براہ پایا، ان میں وہ عزیز بھی تھے جن کو دیکھ کر دو دہائیاں بیت چکی تھیں اور ایسے نوجوان اور بچے بھی تھے جن کو آنکھیں پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھیں۔ اس دنیا میں ملاقات اور دید سے مایوسی کے ایسے لمحات بھی شاید آئے ہوں کہ آج کا یہ دن خواب سا معلوم ہو رہا ہو اچند چہرے تصویر حیرت بنے ہوئے اور اس اندیشہ کا شکار کہ الٰہی یہ خواب نہ ہو۔

کچھ زبان بے زبانی سے بہت کچھ کہتے ہوئے، چند آنکھوں سے دفور مسرت یا نہ جانے کس جذبہ سے سیل اشک رواں اور چند خوشیوں سے بے قابو، نعرہ مستانہ لگاتے ہوئے، سیاست کی بے ضمیری اور بیدردی کے یہ نقوش برصغیر کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں۔

سندھ کی ریت نے کپڑے اور چہرے کی ہیئت بدل دی تھی، جلد غسل کر کے اپنے آپے میں آنے کے لئے طبیعت بے چین تھی، سب سے پیچھا چھڑا کر غسل خانہ کا رخ کیا، چوبیس گھنٹے کے ریل کے تھکا دینے والے سفر کے بعد اپنے میں نئی زندگی محسوس ہوئی،

"جعلنا من الماء کل شیئ حیا"

راقم سطور کا آبائی وطن ضلع ہزارہ صوبہ سرحد ہے، والد صاحب بھی سرحدی پٹھان ہیں۔ اور والدہ مرحومہ بھی وہیں کی تھیں۔ میری پیدائش پونہ میں ہوئی، پروان احمد نگر میں چڑھا، اعلیٰ دینی تعلیم مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی اور اب وہیں مقیم ہوں۔ کراچی میں اپنے آبائی وطن کے عزیزوں کی بڑی تعداد آباد ہے، ہمشیرہ اور بہنوئی صاحب ایک ایک کا تعارف کراتے رہے اور حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبہ سے سب سے معانقہ اور مصافحہ ہوتا رہا۔ تھوڑی دیر کے لئے پشتو کا ماحول پیدا ہو جاتا، کبھی پشتو آلود اردو کان میں پڑتی۔ دریافت اور انکشاف کا یہ سلسلہ رات دیر تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں مولوی فضل ربی ندوی ملنے آئے، ندوہ کے لائق فرزند، حضرت مولانا مدظلہ کی کتابوں کے پاکستان میں ناشر، ادارہ نشریات اسلام کے نام سے ایک کامیاب اور بامقصد ادارہ چلا رہے ہیں۔ اس ادارہ نے پاکستان کے علمی حلقوں میں ایک ممتاز اور قابل رشک مقام حاصل کر لیا ہے رات ہی ایک نو دریافت عزیز سرور خاں صاحب سے طے ہوا کہ وہ صبح مجھے ان شخصیتوں سے ملانے کے لئے اپنے اسکوٹر پر لے جائیں گے، جن سے حضرت مولانا کے پروگرام کے سلسلے میں ملنا ضروری تھا۔ (جاری)

بقیہ صفحہ ۲۳

اس لئے سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ اس پریشان و نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا ہے، ملک کے گوشے گوشے میں یونیورسٹیاں ہیں، اعلیٰ تعلیمگاہیں ہیں ـــ (ACADMIES) بھی ہیں اور ریسرچ بھی ہو رہا ہے، شعر و شاعری بھی ہو رہی ہے، عمدہ عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں، بلکہ ایک علمی نفا سارے ملک پر چھائی ہوئی ہے، لیکن اگر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے تو وہ اخلاق درست کرنے والا کام ہے، انتظام درست کرنے والا، اعتماد کرنے والا کام ہے اور آپس میں محبت پیدا کرنے والا کام ہے۔ اور کوئی ایسی تبلیغ یا کوئی ایسی کوشش جس سے انسان کے جان کی قیمت معلوم ہو اور یہ معلوم ہو کہ انسان پر ہاتھ اٹھانا کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا پاپ ہے، ایسی دعوت و تحریک کہ جس سے معلوم ہو کہ انسان خدا کا بنایا ہوا ہے، جو اس پر ہاتھ اٹھائے گا گویا خدا پر ہاتھ اٹھائے گا وہ خدا کی بڑی پیاری و محبوب چیز پر ہاتھ اٹھا رہا ہے۔

ایک ضروری اعلان!

مکرمی! سلام مسنون

راقم سطور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے مکتوبات ترتیب دے رہا ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سے مکتوبات حاصل بھی ہو چکے ہیں، لیکن ابھی تک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

راقم سطور آپ کے موقر جریدے کے ذریعہ ان تمام حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ جن کے پاس حضرت مولانا مدظلہ کے مکتوبات یا ایک بھی مکتوب ہو وہ براہ کرم مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمادیں، مکتوبات نقل کر کے انشاء اللہ بحفاظت واپس کر دیے جائیں گے۔

امید ہے کہ تمام متعلقین حضرت مولانا مدظلہ، خصوصی توجہ فرما کر راقم سطور کو شکریے کا موقع مرحمت فرمائیں۔

والسلام مع الاکرام

محمد عثمان قریشی
دارالرحمت، ۳۶ چکمنڈی لکھنؤ
(۲۲۶۰۰۱)

امنگوں اور قوتوں میں کمی محسوس ہو تو پژمردہ نہ ہوجیے!
اس کمی کی وجہ آپ کے جسم میں تغذیہ کی خرابی ہے اور یہ اتنی بڑی بات نہیں کہ آپ کو زندگی کی بہاروں اور خوشیوں سے لطف اندوز ہونے سے روک دے۔
قوت میں کمی کے پہلے احساس کے ساتھ ہی آپ لحمینہ کا استعمال شروع کر دیجیے۔
لحمینہ آپ کے جسم کو طاقت و توانائی اور صحیح تغذیہ دینے والے چالیس اہم اجزا کا مرکب ہے، جو اعصاب کو نئی قوت پہنچاتے ہیں اور اعضائے رئیسہ کو تازگی دیتے ہیں۔

مردوں اور عورتوں کے لیے
لحمینہ۔
ہمدرد
جسمانی قوتوں کی بیداری کا نشان

شام کی ایک عظیم علمی و دینی شخصیت

علامہ شیخ حسن حبنکہ میدانی مرحوم

حالات و تاثرات

از: قاضی محمد فاروق بھٹکلی ندوی۔ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

★

دمشق (شام) سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے نام موصول شدہ خط سے یہ اطلاع بجلی بن کر ہم ناتوانوں کے قلب پر نازل ہوئی کہ ہمارے مربی اور استاذ حضرت علامہ شیخ حسن حبنکہ میدانی مورخہ ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ بروز دوشنبہ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء قبل از فجر اس جہان فانی سے دار آخرت کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے دوسرے دن یعنی ۱۴ ذی القعدہ ۹۸ھ بروز منگل علی الصبح مصر اور عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود بھی سفر آخرت کر گئے (جنکی خبر مختلف اخبارات میں آچکی ہے) گویا بیک وقت مصر و شام بلکہ عالم اسلام دو عظیم علمی و دینی شخصیتوں سے محروم ہو گیا اور عام دنیا کے مسلمانوں کو وہ عظیم علمی و دینی خسارہ پہونچا جس کی تلافی شائد عرصہ دراز تک نہ ہو سکے گی۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نہایت کریم ہے، اور وہ قادر مطلق بھی ہے، جب چاہے اور جہاں سے چاہے زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے شخصیتوں کو پیدا کر سکتا ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ مگر بقول ڈاکٹر اقبال رح ے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ بات بھی دنیا کے عام دستور اور ظاہری حالات کے پیش نظر ایک کھلی ہوئی حقیقت پر مبنی ہے۔ بے شک اس دنیا میں ہر شخص پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ ایک محدود مدت تک زندگی گذار کر سفر آخرت اختیار کرے۔ دنیا میں آنا اور دنیا سے رخصت ہونا یہ ایک ازلی قانون ہے جس سے کسی کو مفر نہیں، لیکن جن عظیم شخصیتوں سے دنیا علم و ہدایت، یقین و معرفت، زہد و تقویٰ، صبر و مجاہدہ، عشق الٰہی اور خدمت خلق کے جذبہ سے معمور و مخمور ہو جائے اور جن کے ذریعہ سے خزاں رسیدہ عالم میں ایمان کی بہار آجائے اور جن کی ساری زندگی دنیا کے لیے خیر ہی خیر بن جائے۔ گویا وہ حدیث کے الفاظ میں مفتاحاً للخیر اور مغلاقاً للشر (خیر کی کنجی اور خاتم شر) ہوں۔ ایسی شخصیتوں کا اٹھ جانا (خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ دنیا کو ان کی شدید ضرورت ہو) امت کے حق میں قیامت صغریٰ سے کم نہیں ہے لیکن قربان جائیے سرور دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کہ آپ نے اپنی زندگی اور موت سے اپنی امت کے لیے صبر و تسلی اور اطمینان و سکون کا سامان فرما دیا۔ فرمایا کہ میری موت سے بڑھ کر اس امت کے لیے کوئی دوسرا حادثہ اور مصیبت نہیں ہو سکتی ہے (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو آنحضور صلعم کے وصال سے آزما کر صبر و سکون کی ہمت نصیب فرمائی تو آپ کے بعد صحابہ رض و تابعین رح سے لے کر تمام عظیم شخصیتوں کا سانحہ ارتحال بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحہ ارتحال کے مقابلہ میں کمتر درجہ کی حیثیت رکھتا ہے، بقول ایک صحابیہ رض کے ے

کل مصیبۃ بعدک جلل
(آپ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت آسان ہے)

اس ناچیز نے محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل خصوصاً مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے مشورے اور ان کی پدرانہ محبت و شفقت کے نتیجہ میں دمشق (سوریہ) جا کر فروری ۱۹۷۳ء کو حضرت علامہ شیخ حسن حبنکہ مرحوم کی خدمت عالیہ میں بغرض علمی و دینی استفادہ بطور مہمان خاص شرف نیاز حاصل کیا اور تقریباً ۳ سال کا عرصہ وہاں گذار کر حضرت شیخ مرحوم کی عظیم المرتبت شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور ان کی تمام تر خوبیوں سے بخوبی آگاہ اور مستفید ہونے کی سعادت حاصل کی۔ فللہ الحمد والشکر۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی ناچیز کی طرف بہترین شکریہ کے مستحق ہیں، (اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بھر پور اجر عطا فرمائے۔ آمین) کہ انہوں نے ناچیز کی علمی و دینی تربیت کے لیے ایک ایسی عظیم شخصیت کا بالکل صحیح انتخاب فرمایا جن کا شمار ہر لحاظ سے بلاشبہ اس وقت عالم اسلام کے عمومی اور بلاد عربیہ کے خصوصی حالات کے پیش نظر ایک عدیم النظیر اور نادر الوجود شخصیتوں میں ہو سکتا ہے۔

مرحوم نہ صرف سوریہ کے ایک جلیل القدر عالم و فاضل اور بلند پایہ دینی و روحانی پیشوا تھے بلکہ ایک عالی ہمت مجاہد اور دینی و سیاسی بصیرت رکھنے والے باکمال بزرگ تھے بقول حضرت مولانا مدظلہ العالی وہ سوریہ کے بے تاج کے بادشاہ تھے۔ انہیں سوریہ کے صف اول کے اساتذہ اور طبقہ علماء سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے جن کے سرخیل شیخ وقت محدث شام علامہ بدرالدین حسنی رحمۃ اللہ علیہ تھے (جنکے متعلق شام کے اکثر بزرگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ عہد صحابہ کی یادگار اور ان کے مشابہ معلوم ہوتے تھے) اور شام کی فرانسیسیوں سے آزادی میں وہی روحانی قائد تھے) اور جن کی روحانی و علمی و دینی عطر بیزی سے سرزمین شام آج تک مہک رہی ہے۔ ان سے فیض حاصل کرنے اور شرف انتساب حاصل کرنے والوں میں حضرت شیخ حسن حبنکہ مرحوم کے علاوہ شیخ ابوالخیر میدانی رح، شیخ محمد علی دقر رح، شیخ عبدالقادر قصاب، شیخ ابراہیم غلایانی رح، شیخ محمود العطار رح اور مجاہد عظیم شیخ محمد الاشمر رح وغیرہ بہت ہی مشہور و معروف حضرات ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوتے گئے۔ آخر میں شیخ حسن حبنکہ مرحوم کی ایک مشہور ذات رہ گئی تھی جن کا شمار شیخ بدرالدین حسنی رح کے محبوب ترین شاگردوں میں تھا اور وہ ہر لحاظ سے ممتاز اور اپنے سلف کی یادگار تھے۔ افسوس صد افسوس کہ وہ بھی راہی ملک عدم ہو گئے۔ ے

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ان کی وفات کے بعد اب شیخ بدرالدین حسنی کے قافلہ میں سے کوئی ایسی قابل ذکر شخصیت باقی نہیں رہ گئی جو اس پایہ کی کہی جا سکے جس پایہ کی شخصیت خود وہ اور ان کے کبار تلامذہ میں تھے یہ درخشاں اور طلائی زنجیر یا سلسلۃ الذہب حضرت حسن حبنکہ رح کے انتقال کے بعد بالکل تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی ے

"اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر"

یوں تو حضرت شیخ حسن حبنکہ مرحوم سرزمین شام میں تقریباً ۶۰ ـ ۷۰ سال تک اپنے روحانی و علمی و دینی فیوض و برکات سے ضیا پاشی کرتے رہے اور اپنی حق گوئی، بے باکی اور مجاہدانہ زندگی سے وہاں کے مسلمانوں میں ایک نئی دینی لہر دوڑا دی۔ ظالم اور جابر حکمرانوں کے سامنے بھی وہاں کے سخت ترین حالات میں (جن کا تصور ہم ہندوستان کے جمہوری ملک میں رہ کر صحیح طور پر نہیں کر سکتے ہیں) حق بات کہنے اور دینی دعوت پیش کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور اس سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کی اور کفن بردوش ہو کر حق کا نعرہ لگایا۔ اس راستے میں پیش آمدہ ہر قسم کی تکلیفات کو جھیلا، جیل بھی گئے، پھانسی کی سزا کا بھی حکم ہوا۔ آپ کے مدارس، کتب خانہ اور دیگر ذاتی املاک پر حکومت کا قبضہ ہو گیا۔ اور آپ کے لیے دعوتی میدان زیادہ سے زیادہ تنگ کیا گیا لیکن اسکے باوجود شیخ نے صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نہایت پامردی اور ایمانی جرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی۔ بالآخر حق غالب آیا اور باطل ھباءً منثوراً ہو گیا۔ آپ کو ایذا دینے والوں اور دین کی توہین کرنے والوں کا انجام بہت ہی برا ہوا۔ اور حضرت شیخ کو عنداللہ و عندالناس سرخروئی، برتری اور فضیلت حاصل ہو گئی۔

(باقی آئندہ)

مکتوب امریکہ

ایک دن اقوام متحدہ کی عمارتوں میں

محمد سمیع صدیقی ایم۔ اے

۶ جون ۱۹۷۸ء کو اقوام متحدہ کی عمارتوں کے دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۰ بجے ڈاکٹر مطیع نے کار نکالی ہم سب سوائے دو بچوں رشدی اور فیضی کے اس میں بیٹھ گئے۔ کار لانگ آئی لینڈ کے جزیرہ سے نکل کر کوئنس (Queens) کے علاقہ میں بھی داخل ہوئی اور مشرقی دریا کے ساحل کے قریب پہنچی۔ شہر میں داخل ہونے کے دو راستے سامنے تھے۔ آیا پُل سے گزرا جائے یا ٹنل (Tunnel) سے۔ پل روز ولٹ جزیرہ سے گزرتا ہے اور ٹنل دونوں ساحل کے درمیان اتصال پیدا کرتا ہے۔ یہ ٹنل Queens Midtown Tunnel کے نام سے موسوم ہے۔ کار کا رخ اسی طرف ہو گیا۔ داخلے سے پہلے ہر لین پر گمٹیاں بنی ہوئی ہیں جس سے گزرنا لازمی ہے اور ٹال (Toll) ایک ڈالر کے قریب لیا جاتا ہے۔ نظم ایسا ہے کہ دو منٹ میں سب طے ہو جاتا ہے۔ کم سے کم چھ گمٹیاں ہیں جس میں ہر وقت اشخاص ڈیوٹی پر لگے رہتے ہیں۔ ایک گمٹی کے پاس کار رکی داخلہ کی فیس ادا کی گئی اور ٹنل کے اندر داخلہ ہو گیا۔ خیال ہوا کہ تنگ سرنگ ہوگی۔ کچھ ہلکی روشنی میں چلنا ہوگا۔ ایسا نہ تھا۔ ٹنل کے اندر بھی شاہ راہ کی شان باقی تھی۔ کئی کاریں ایک ہی رخ میں چلی جا رہی تھیں جن کے علیحدہ علیحدہ لین (Lanes) بنے ہوئے تھے۔ برقی روشنی دیواروں میں آویزاں تھی۔ ایک ایک چیز نمایاں سامنے نظر آئی۔ بائیں جانب کی دیوار سے متصل تین فٹ کی بلندی پر پیدل چلنے والوں کے لئے راستہ بنا ہوا ہے جس پر چند لوگ چلتے نظر آئے۔ یہ سرنگ مستقیم انداز کی نہیں ہے داہنے اور بائیں مڑتی رہتی ہے۔ یہاں سڑک کے داہنے طرف سواریاں گزرتی ہیں، یہی قانون ہے۔ رفتار کے لئے جا بجا ہدایت بھی دیواروں پر آویزاں ہوتی کہ چالیس میل کی رفتار سے موٹر چلائی جائے۔ مگر تیز رفتار ذہن والے کاروں کو چالیس پچاس میل کی رفتار سے چلاتے رہتے ہیں۔ اگر پرسش ہو جاتی ہے تو جرمانہ ادا کرتے ہیں۔ یہاں بہت کا قانون ایسا بنا ہوا ہے اور اس کی پابندی کی جاتی ہے کہ کہیں نازک سے نازک موڑ پر کوئی ٹریفک پولیس نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر مطیع محتاط انداز میں کار چلاتے رہے۔ آخر چند منٹ کے بعد دوسرے سرے پر دن کی روشنی جھلکنے لگی۔ کار اس طرف مڑی اور سرنگ سے باہر نکل آئی۔ مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے جس کے دونوں طرف سر بفلک عمارتیں ہیں ۴۲ ویں اسٹریٹ پر کار رکی۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلہ پر اقوام متحدہ کی عمارتوں کے سامنے گزرنے والی سڑک واقع ہے۔ عمارتوں کے درمیان ایک کھلا ہوا ہال نظر آیا جس پر کار پارک کرنے کے اوقات لکھے ہوئے تھے۔ کار اندر چلی گئی۔ دو اشخاص فوراً متوجہ ہو گئے۔ ایک نے پارک کرنے کا ٹکٹ دیا، دوسرے نے کار پر قبضہ کیا اور کسی محفوظ جگہ لیکر چلا گیا۔

اب اطمینان سے آگے بڑھے اور سڑک پر آ گئے۔ سڑک کا پار کرنا بھی قیامت ہے۔ گزرنے کا ایک مقام بنا ہوا ہے۔ سپیدی سے سڑک پر خطوط بنے ہوئے ہیں۔ سبز اور سرخ روشنی سے جانے اور ٹھہرنے کے اشارات ملتے رہتے ہیں۔ جب جانے کا اشارہ ملتا ہے، یعنی سبز روشنی ہوتی ہے تو پیدل گزرنے والے ایک طرف سے دوسری طرف جلد جلد نکل جاتے ہیں۔ اس درمیان کاروں کو سرخ روشنی یعنی رک جانے کا اشارہ ملتا ہے۔ بغیر کسی حادثہ کے آمد و رفت ہوتی رہتی ہے اور نظم برقرار رہتا ہے۔

ایک کنارہ پر ہم سب کھڑے ہو گئے سبز روشنی کا اشارہ ملتے ہی دوسری جانب نکل گئے اور جنرل اسمبلی کی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ چند قدم پر داخلہ کا پھاٹک ملا۔ اردگرد کا جائزہ لیا۔ ایک طرف سکریٹریٹ کی ۳۹ منزلہ عمارت ہے۔ دوسری جانب کتب خانہ کی عمارت اسی کے ملحق کانفرنس کی عمارت ہے جنرل اسمبلی کی گنبد والی عمارت اس وسیع چبوترہ سے ملحق ہے۔

اس چبوترہ سے دیکھا کہ رنگا رنگ جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ یہ سب اقوام متحدہ کے ممبر ممالک کے ہیں جو پانچ سو فٹ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ قریب ہی ایک گول حوض ہے۔ فوارہ رواں ہے۔ اس فوارہ کو ممالک متحدہ امریکہ کے بچوں نے پچاس ہزار ڈالر سے تعمیر کرایا ہے۔ اس حوض کے کنارے سابق سکریٹری جنرل ڈاگ ہیمرشولڈ کا بُت نصب ہے۔

دوسرے جانب زینوں سے اُتر کر اس حصہ میں پہونچے جہاں گل و سبزہ کے تختے ہیں مختلف قسم کے پھل دار اور پھول کے ہرے بھرے درخت لگے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر بیلیں چڑھی ہوئی ہیں ان کی تراش ایسی ہے کہ انگریزی حروف بن گئے ہیں اور صاف یو۔ این۔ او (U.N.O.) پڑھا جاتا ہے۔ نصف گھنٹہ روشوں پر گھومتے رہے۔ گلاب کے کھلنے کا موسم تھا۔ مختلف رنگوں کے گلاب بہت بڑے کھلے ہوئے تھے۔ دو ہزار سے زیادہ گلاب کی جھاڑیاں ہیں ۱۸۵ چیری کے درخت ہیں، ۵۲ پھل دار درخت لگے ہوئے ہیں ان کے درمیان اسفلٹ کے بنے ہوئے راستے ہیں۔ بعض محرابی راستے ہیں۔ ان باغات میں جو مشرقی دریا کے کنارے ہیں کئی بت نصب ہیں جو روس، یوگوسلاویا اور جرمنی نے عطیہ کے طور پر اقوام متحدہ کو دیے ہیں۔ وسط دریا میں ایک فوارہ نظر آیا جو تقریباً ۵۰ فٹ بلند پانی اچھال رہا تھا اور آبشار کے مانند پانی پھوہار بن کر گر رہا تھا۔ ان مناظر سے لطف اندوز ہو کر ہم لوگ اسی زینہ سے پھر چبوترہ پر آ گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ابھی تک خارجی مناظر سامنے تھے۔ جنرل اسمبلی کی عمارت کا دروازہ سامنے تھا ہم سب اٹھے اور اندر داخل ہو گئے۔ قدم رکھتے ہی دروازہ خود بخود کھلتا ہے اور قدم ہٹتے ہی بند ہو جاتا ہے اسی طرح ہر شخص کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ ہال کے بائیں جانب جا کر ایک حصہ میں بنچوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر مطیع داخلے کا ٹکٹ لے آئے۔ قریب بارہ بجے ہوں گے کہ ایک خاتون گائڈ آ گئیں عمر ۲۵ سال کی ہوگی۔ سب کو اپنی قیادت میں لے کر اسکیلیٹر کی طرف بڑھیں۔ پندرہ بیس اشخاص لفٹ کے اندر کھڑے ہو گئے اور منٹوں میں تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ جنرل اسمبلی ہال کے بالائی گیلری میں داخل ہو گئے۔ اسٹیڈیم کے انداز میں سیٹیں لگی ہوئی ہیں۔ ہر سیٹ کے داہنے پیچھے میں ایرفون Earphone لگا ہوا ہے جس سے اسپیکر کی تقریر بایک وقت ترجمہ سنا جا سکتا ہے۔ یہ ترجمہ پانچ زبانوں میں ہوتا رہتا ہے۔ اب عربی کو بھی اسمبلی کی زبانوں میں شامل کر لیا گیا ہے سیٹ پر بیٹھنے والا اسپیچ یا ترجمہ سن سکتا ہے۔

قانون گائڈ نے سب کو گیلری کے قریب کے سیٹوں پر بٹھا دیا اور اقوام متحدہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔

ادارہ اقوام متحدہ (یو۔ این۔ او) کا وجود ۲۴ / اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ہوا ہر سال اسی تاریخ کو اس کا دن منایا جاتا ہے۔ اسی تاریخ کو اس کے چارٹر کا نفاذ ہوا جسے فرانسسکو کے مقام پر عالمی جنگ دوم کے اختتامی ایام میں تیار کیا گیا تھا۔ کچھ متعلقہ ملکوں نے طے کیا کہ اقوام متحدہ کا ادارہ قائم کیا جائے جس کا مقصد بین اقوامی امن اور تحفظات ہو۔ اقوام کے درمیان دوستانہ تعلقات ہوں بین اقوامی اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور انسانی مسائل طے کئے جائیں اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کا علمبردار ہو، ایسا مرکز ہو کہ ان تمام باتوں کو بروئے کار لائے۔ اور عام مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

ادارہ اقوام متحدہ کوئی بالا تر عالمی حکومت نہیں ہے بلکہ ساری ممبر حکومتیں آزاد ہیں۔ چھوٹی بڑی۔ مالدار اور غریب سب حکومتیں مساوی درجہ رکھتی ہیں۔ البتہ بین اقوامی امن قائم رکھنے کے لیے سلامتی کاؤنسل (سیکورٹی کاؤنسل) کے ذریعہ قدم اٹھایا جا سکتا ہے اور مداخلت کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک ملکوں کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے سب آزاد ہیں۔ چارٹر کا نظریہ یہ ہے کہ ممالک اپنے تنازعہ کو پرامن طور پر طے کریں۔ اور ادارہ اقوام متحدہ مدد دے۔ یہ قانون ساز مجلس نہیں ہے بلکہ اکٹھا ہونے کا مقام ہے جہاں اکثر ممالک شرکت کرتے ہیں۔ یہ بھانت بھانت کے ملک ہوتے ہیں۔ مختلف النوع سیاسی، معاشرتی اقتصادی سسٹم کے رکھنے والے ممالک اپنی اپنی آوازیں بلند کرتے ہیں اس کی قوت مجموعی آواز میں ہے جسے حکومتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ ابتدا میں ۵۱ ممبر تھے ۱۹۷۸ء تک ۱۴۹ ہو گئے۔ یہ ادارہ اقتصادی پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے ۸۵ فیصد رقم امن قائم رکھنے پر صرف کی جاتی ہے۔ اس کے کاموں میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مثلاً ایٹمی توانائی کا پرامن استعمال۔ انسانی حقوق اور مرد، عورت اور بچوں کے حقوق پر کنونشن ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جنرل اسمبلی نے عام انسانی حقوق کا اعلان کیا جہاں اس کی پامالی ہوتی ہے اسکی طرف توجہ کرتی ہے مثلاً جنوبی افریقہ میں جہاں لاکھوں کی تعداد میں انسانی نفوس اس حق سے محروم ہیں۔

ادارہ اقوام متحدہ کے چھ اعضاء ہیں۔

جنرل اسمبلی، سیکورٹی کاؤنسل (سلامتی کاؤنسل) اقتصادی اور سوشل کاؤنسل، ٹرسٹی شپ کاؤنسل، سکریٹریٹ اور بین اقوامی عدالت آخر الذکر ہیگ کے مقام پر (نیدر لینڈ) میں قائم ہے۔ بقیہ سارے اعضاء نیویارک میں ہیں۔ جنرل اسمبلی کی مخصوص کمیٹیاں دوسرے ممالک میں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ایٹمی توانائی، عالمی تجارت اور انسانی حقوق پر مذاکرات ہوتے رہتے ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹرس نیویارک میں ہیں جہاں عالم کے نمائندے امن کی تلاش زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اس ادارہ کا پہلا جلسہ ۱۹۴۶ء میں لندن میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۲ء سے جب کہ عمارتیں تکمیل کو پہنچ گئیں نیویارک مرکز بنا ہوا ہے ہر قسم کے لوگوں کے لیے مقام کشش ہے۔ دنیا کے گوشہ گوشہ سے لوگ آتے رہتے ہیں۔ عمارتیں مشرقی دریا کے ساحلی حصہ میں واقع ہیں جنرل اسمبلی، کانفرنس، سکریٹریٹ اور کتب خانہ کی عمارتوں پر مشتمل ہیں سب سے نمایاں اور بلند عمارت سکریٹریٹ کی ہے جو ۳۹ منزلہ ہے۔ جنرل اسمبلی کی عمارت مع گنبد کے کئی زاویوں کے ساتھ بنی ہے۔ اور اقوام متحدہ کی علامتی شکل ہے۔ سکریٹریٹ کا اسٹاف چھ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ ۲۵۰ پریس کے لوگ ہیں جب جلسہ ہوتا ہے تو اس میں اضافہ ہو جاتا ہے جنوبی مغربی سمت کتب خانہ ہے جو سابق سکریٹری جنرل ڈاگ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ چھ منزلہ عمارت ہے، تین سطح زمین کے اوپر اور تین زیر زمین۔ فرش کا رقبہ اتنا ہے کہ چار لاکھ کتابوں کی جلدیں رکھی جا سکتی ہیں۔ ریفرنس کی کتابیں۔ نقشے اور لیگ آف نیشن کے اہم استاد رکھے ہوئے ہیں۔

جنرل اسمبلی ہال: اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے یہ دوسرے، تیسرے اور چوتھی منزلوں پر مشتمل ہے۔ نیلا، ہرا اور سنہرے رنگ کا ہال ۱۶۵ فٹ لمبا اور ۱۱۵ فٹ چوڑا ہے۔ چھت ۷۵ فٹ بلند ہے۔ ایک چار فٹ قطر کی دائرہ والی چھت گیر روشنی مثل آفتاب کے فرش ہال پر پڑتی رہتی ہے۔ سامنے اٹیلین مرمری چبوترہ ہے۔ وسط میں پریسیڈنٹ (President) کی سیٹ ہے جو ہر سیشن کے آغاز میں منتخب ہوتا ہے اس کے داہنے جانب سکریٹری جنرل کی سیٹ ہے اور بائیں جانب جنرل اسمبلی کے معاملات کے انڈر سکریٹری کی سیٹ ہے۔ اس کے پشت پر اقوام متحدہ کا نشان ہے اس سے ملحق اسپیکر کے لیے بلند اسٹینڈ ہے۔ اس کے داہنے اور بائیں وہ میز نما مقام ہے جس پر ہر ملک کا نمائندہ جا کر ایک بٹن دبا کر ووٹ دیتا ہے۔ ہری روشنی "ہاں" کی علامت ہے سرخ روشنی "نہیں" اور زرد روشنی عدم شرکت کی علامت ہے۔ فرش پر ہر ڈیلیگیٹ کے چھ ممبروں کے لیے سیٹیں لگی ہوئی ہیں۔ سب سے آگے کی سیٹ پر کون ڈیلیگیٹ بیٹھے اس کے لیے قرعہ ڈالا جاتا ہے اس کے بعد انگریزی حروف تہجی کے اعتبار سے بقیہ لوگ بیٹھتے ہیں۔ دو ہزار ستر سیٹوں میں ایرفون (Earphone) لگے ہوئے ہیں جس سے تقریر اور ترجمہ سن سکتے ہیں۔ لکڑی کی سنہری دیوار کے مانند بوتھ (Booth) بنے ہوئے ہیں جو شیشوں سے گھرے ہیں، جو ترجمان، پریس، ریڈیو، فلم اور ٹیلیویژن سہولتوں سے مزین ہیں۔ جو دنیا کے دیکھنے اور سننے کا ذریعہ ہے کہ جنرل اسمبلی میں کیا کام ہو رہا ہے۔ داہنے اور بائیں دیواروں کو ایک فرانسیسی فنکار نے نقش و نگار سے آراستہ کر دیا ہے۔

جنرل اسمبلی میں ۱۴۹ ممبر حکومتوں کو نمائندگی حاصل ہے۔ عام حالات میں صرف معمولی اکثریت کافی ہوتی ہے مگر اہم معاملات میں دو تہائی کی اکثریت ضروری ہے۔ اس کا سالانہ اجلاس (سیشن) ستمبر کے تیسرے منگل سے شروع ہو کر وسط دسمبر تک جاری رہتا ہے۔ عالمی معاملات چارٹر کے اندر رہ کر طے کیے جاتے ہیں۔ فیصلے بھی ہوتے ہیں مگر اسے طاقت حاصل نہیں ہے کہ اپنے فیصلہ کو کسی ملک سے زبردستی منوائے۔ البتہ اخلاقی اور عالمی رائے سے متاثر کرتی ہے۔ جب سلامتی کاؤنسل کے ممبروں میں اختلاف ہوتا ہے اور امن عامہ خلل کا شکار ہوتا ہے تو خاص سیشن منعقد کیا جاتا ہے تاکہ معاملہ کو قابو میں لایا جائے اس کا کام فلاح عامہ۔ پناہ گزینوں کا معاملہ۔ اقتصادی اور صنعتی معاملات میں تیزی پیدا کرنا، بجٹ منظور کرنا اخراجات کا حکومتوں پر بار ڈالنا، سکریٹری جنرل کی تقرری کو منظور کرنا وغیرہ ہے۔

سلامتی کاؤنسل: اس کے چیمبر کے مشرقی دیوار پر ناروے کے فن کار نے اقوام متحدہ کے نظریہ کے مطابق نقش و نگار بنائے ہیں جن سے مستقبل میں امن اور انفرادی آزادی کا اظہار ہے۔ دیواریں سنگ مرمر کی ہیں۔ نیلے اور سنہرے پردے لٹک رہے ہیں لکڑی کے دروازوں پر نقش کھودے ہوئے ہیں۔ یہ کمرہ ۷۲ فٹ چوڑا اور ۱۳۵ فٹ لمبا ہے۔ سلامتی کاؤنسل کا خاص کام امن کی تلاش اور اس کا قائم رکھنا ہے۔ اس کے پندرہ ممبر ہوتے ہیں جن میں پانچ مستقل ممبر ہیں یعنی چین، فرانس، روس، یو۔کے (برطانیہ) یو۔ ایس۔ اے (امریکہ) دوسرے ممبروں کا انتخاب دو برس کے لیے جنرل اسمبلی کرتی ہے ہر ممبر کو ایک ووٹ حاصل ہے۔ عام معاملات میں نو ممبروں کے ووٹ پر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی مستقل ممبر نفی کا ووٹ دیدیتا ہے جسے Veto (ویٹو) کہتے ہیں تو فیصلہ رد ہو جاتا ہے۔ اگر پانچوں ممبر میں سے کوئی عدم شرکت سے کام لیتا ہے تو اسے ویٹو نہیں شمار کیا جاتا۔ سلامتی کاؤنسل کا جلسہ ضرورت کے لحاظ سے ہر وقت ہو سکتا ہے۔ ہر ممبر ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جب تنازعہ حد سے زیادہ تجاوز کر جاتا ہے تو جنگ بندی کی کوشش کرتی ہے۔ مثلاً قبرص، کشمیر، کانگو، مڈل ایسٹ وغیرہ شاید یا فوجی دستے محرکہ آرا پارٹیوں کے درمیان جگہ لے لیتے ہیں۔ سلامتی کاؤنسل کا دستہ، جنگ بندی فیصلہ کی نگرانی کرتا ہے مثلاً جنوبی افریقہ کے خلاف اسلحہ کی پابندی۔

اقتصادی و سوشل کاؤنسل چیمبر: اسے سویڈن کے فن کار یعنی نقاش نے شکل دی ہے۔ ہلکے رنگ سے چھت کی نقاشی کی ہے جس سے غیر معمولی لطف پیدا ہوتا ہے۔ فرش سنگ مرمر کا مرمر کا چھت میں روشنی کے پوشیدہ قمقمے لطف میں اضافہ کرتے ہیں۔ قالین۔ دیوار میں لکڑی کا حاشیہ خوبصورت دروازے سب کو سویڈن نے پیش کیا ہے۔ اس کا کام جنرل اسمبلی کے تحت عالمی خوش حالی اور استقلال ہے۔ اس ۵۴ ممبر ہوتے ہیں۔ اس کے جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ تعلیمی ترقی، صحت، جدید نقل و حرکت جدید سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ سے سروکار ہوتا ہے۔ ۱۵۰ ملکوں نے مختلف قسم کی امداد حاصل کی ہے۔ امداد کا ایک جال سا بچھا رکھا ہے۔ لیبر، ایجوکیشن، ایگری کلچر، صحت، سول پرواز، ایٹمی توانائی، رسل رسائل وغیرہ۔

بین اقوامی عدالت: یہ ایسا ادارہ ہے جو ہیگ کے مقام پر یورپ (نیدر لینڈ) میں قائم ہے۔ اس عدالت کے پندرہ جج ہوتے ہیں۔ ان کا انتخاب جنرل اسمبلی اور سلامتی کاؤنسل کرتی ہے۔ جج انفرادی حیثیت سے کام کرتے ہیں کسی حکومت کی نمائندگی نہیں کرتے اس تک ہر ممبر کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اس کے اختیار کو بہت سے ممبروں نے لازمی تسلیم نہیں کیا ہے۔

سکریٹریٹ: ۵۰۵ فٹ بلند عمارت ہے مشرقی اور مغربی حصوں میں ہرے رنگ کے شیشے لگے ہوئے ہیں۔ شمالی اور جنوبی حصوں میں سنگ مرمر کی پردہ نما دیواریں ہیں۔ ۳۹ منزلہ ہونے کے ساتھ تین منزل زیر زمین بھی ہے۔ برقی متحرک تختے فائلوں اور کاغذات کو منتقل کرتے رہتے ہیں۔ سکریٹری جنرل اس کا ہیڈ (Head) ہوتا ہے اور ۳۸ ویں منزل پر اس کا آفس ہے۔ سلامتی کاؤنسل کے سامنے ایسے معاملات پیش کرتا ہے جس سے امن عالم خطرے میں ہو۔ اس وقت کرٹ والڈ ہیم (Kurt Waldheim) جو آسٹریا کے ہیں سکریٹری جنرل ہیں۔ سکریٹریٹ کا اسٹاف سو ملکوں کے اشخاص پر مشتمل ہے۔

مختلف عمارتوں اور جنرل اسمبلی کے متعدد ہالوں کے دیکھنے کے بعد گیلریوں سے گزرے جہاں تعلیمی چارٹ، مختلف ممالک کے کلچر اور سوشل نقشے اور تصاویر بنی ہیں پھر برقی لفٹ کے ذریعہ ہم سب اس ہال میں آ گئے جو سطح زمین کے نیچے ہے۔ یہاں بازار کی سی کیفیت ہے۔ ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ ایک طرف پوسٹ آفس ہے سامنے اسٹال ہے جس میں تحفے خریدنے کے سامان ہیں۔ دوسرے اسٹال میں مختلف ملکوں کے دستکاری کے سامان ہیں۔ ایک گوشہ میں کتابوں کی دکان ہے جہاں اقوام متحدہ اور اس کی ایجنسیوں (Agencies) کی تیار کردہ کتب اور رسالے بکتے ہیں ایک دوسرے گوشہ میں اقوام متحدہ کے کارڈ اور اسٹیشنری خرید کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر مطیع چار کارڈ خرید لائے میں نے دو میں لکھ کر لکھنؤ، دہلی، علی گڑھ اور کراچی روانہ کر دیے۔

وہاں سے اوپر آ گئے اور پھاٹک سے نکل کر سڑک پار کر کے کار کی عمارت تک آئے کار واپس لی گئی۔ چار بج چکے تھے۔ کار میں بیٹھ کر شہر کی ایک ہندوستانی تنزیبی کی دوکان پر رکے۔ ڈاکٹر مطیع ایک کاغذی گلاس میں کوک لائے، پیا گیا کچھ ہندوستانی مٹھائیاں خریدی گئیں۔ پانچ بجے سے پہلے گھر پہنچ گئے۔ آفتاب خوب روشن تھا اپنی گرم شعاعوں سے کام لے رہا تھا۔ دن ساڑھے سترہ گھنٹوں کا تھا۔ آخری وقت میں نماز ظہر ادا کی۔ میرا کمرہ خوب وسیع اور روشن ہے۔ ایرکنڈیشن کام کرتا ہے۔ مولانا علی میاں اور مولوی رابع حسنی صاحب اس میں قیام کر چکے ہیں کچھ ایسی روایت چھوڑ گئے ہیں کہ کسی نہ کسی وقت باجماعت نماز ہو جاتی ہے۔

بعد مغرب مختلف ڈاکٹروں کے خاندان جمع ہو گئے، دیر تک اقوام متحدہ اور عالمی واقعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ آئندہ ممالک متحدہ امریکہ کا دارالخلافہ واشنگٹن جانے کا خیال ہے جو یہاں سے دو سو میل کی دوری پر واقع ہے۔ انشاء اللہ اس شہر کے متعلق اپنے تاثرات لکھوں گا۔

میرا سفرِ حج

از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

آج یکم ذی الحجہ ہے۔ خانۂ کعبہ کے گرد ان دنوں لاکھوں فرزندانِ توحید مراسمِ حج ادا کر رہے ہوں گے۔ درج ذیل مضمون مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے سفرنامۂ حج کی تلخیص ہے۔ شاہ صاحب ... جمعہ ۲۸ ذیقعدہ کو ... رب کعبہ کے حضور حاضر ہو گئے ... ہے نام اللہ کا۔

بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرور عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سر شام کشاید پر بفکر آشیانہ

ادھر کئی سال سے برابر حج بیت اللہ کا ارادہ ہو رہا تھا، مگر کچھ ایسے موانع پیش آتے گئے کہ پورا نہ ہو سکا۔ اس سال اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق عطا فرمائی اور حج بیت اللہ اور بارگاہ نبوی کی حاضری سے مشرف فرمایا۔

راقم ۲۸ فروری کو اعظم گڑھ سے روانہ ہوا۔ بہت سے احباب و مخلصین نے اسٹیشن پر رخصت کیا۔ پانچ دن اپنے وطن رودولی میں ٹھہر کر اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ میرے ساتھ میری بہن، میرے بھانجے اور داماد چودھری اویس احمد سلمہ ایک اور قریبی رشتہ کی بہن اور ان کے داماد منور شیر انجینیر رانچی اور ان کی خادمہ تھی۔ اتفاق سے اُس دن رودولی سے لکھنؤ جانے والی پسنجر ٹرین جس پر مجھے لکھنؤ جانا تھا، تین گھنٹے لیٹ تھی اور اندیشہ تھا کہ اگر اور لیٹ ہو گئی تو لکھنؤ سے جھانسی کی ٹرین جس میں سیٹیں بک تھیں نہ ملے گی۔ اس لئے ہم لوگ جیپ کے ذریعہ جو اسٹیشن سامان پہنچانے آئی تھی روانہ ہوئے، مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو ٹرین کی پہلے اطلاع دے چکا تھا، اس لئے خیال تھا کہ وہ دریاباد اسٹیشن پر ضرور آئیں گے، ان کو فون کرا دیا کہ ہم لوگ جیپ سے جا رہے ہیں۔ اسلئے اسٹیشن پر انتظار کریں، مگر پسنجر ٹرین زیادہ لیٹ نہ ہوئی، اور مولانا کے چھوٹے بھتیجے اور داماد جو اسی ٹرین سے لکھنؤ گئے تھے، چارباغ اسٹیشن پر ہم لوگوں سے ملے اور مولانا کی بیگم صاحبہ کے ... ہدایا و تحائف پہنچائے مولانا سے عزیزداری کا بھی تعلق ہے؛ اس لئے ان کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادی بھی بہن سے ملنے کے لئے دریاباد اسٹیشن پر آئی تھیں، ان سب کی زحمت کا افسوس ہوا۔

لکھنؤ اسٹیشن پر بہت سے اعزہ و احباب رخصت کرنے کے لئے آ گئے تھے، مولانا ابوالعرفان ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی ان کے صاحبزادے یونس سلمہ، نیاز احمد صاحب صدیقی مولانا رضا فرنگی محلی، مولانا محمد میاں، مولانا حامد میاں، مولانا ابوالحسن علی علالت کی وجہ سے اس وقت رائے بریلی میں تھے، انہوں نے اپنے بھانجے اور بھتیجے محمد ثانی اور محمد رابع کو مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور جدہ کے عمائد کے نام تعارفی خطوط دیکر بھیجا تھا۔ وہ ان خطوط کو دینے کے لئے اسٹیشن پر آ گئے تھے، محمد اسلم صاحب رئیس لکھنؤ منشی احترام علی مرحوم کے صاحبزادگان اشتیاق علی علوی اور افتخار علی، عبدالحفیظ صاحب صدیقی لکچرر شبلی کالج اور ان کے والد عبداللطیف صاحب صدیقی، چودھری فریدالحق اسسٹنٹ سکریٹری سنی وقف بورڈ۔ ان کے علاوہ لکھنؤ، بارہ بنکی اور بہار کے بہت سے اعزہ و احباب موجود تھے۔

بمبئی کا ایک ہفتہ کا قیام لوگوں سے ملنے ملانے اور سفر حج سے متعلق ضروری کارروائیوں کی تکمیل میں گذرا۔

خانۂ کعبہ کی حاضری اور اسکے کوائف و تاثرات: حرم کعبہ میں داخلہ کے وقت دل پر جو واردات در کیفیتیں طاری ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان ایسے معاملات ہیں جن کی نزاکت شرح و بیان کی متحمل نہیں، پھر ہر شخص کے ساتھ معاملہ جدا ہوتا ہے، اور اس کی کیفیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، لیکن بالعموم حرم شریف میں داخلہ اور بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتے وقت ہر مسلمان کا دل اس کی عظمت و ہیبت اور اپنے گناہوں کے احساس سے لرز اٹھتا ہے، اس کی طرف قدم بڑھانے بلکہ نظر اٹھانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اپنی بداعمالیوں کا جتنا شدید احساس حرم شریف میں پہلی حاضری کے وقت ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا، سارے گناہ مجسم شکل میں نگاہ کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ کعبہ ایک مجلی آئینہ ہے جسکے سامنے ہر انسان کی اصلی تصویر نظر آ جاتی ہے اور اپنے سراپا گناہ کے وجود سے حرم پاک کی زمین کو آلودہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کی طرف قدم نہیں اٹھتے، لیکن اللہ تعالیٰ مغفرت ہی کے لئے اپنے آستانہ پر بلاتا ہے، اس لئے وہی تسلی کا سامان بھی فرماتا ہے، گناہوں سے مغفرت کا وعدہ یاد آ جاتا ہے۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔

اے میرے بندو جنھوں نے (گناہ کر کے) اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بیشک اللہ سارے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور وہی معاف کرنے والا مہربان ہے۔

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے۔

اس نے تو رحمت اپنے اوپر لازم کر لی ہے۔ معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تو یہ خاص دعا ہے،

رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ۔

اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن کا شہر بنا اور اسکے رہنے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔

یہ دعا کس طرح نامقبول رہتی، چنانچہ خدا نے بیت اللہ کو گناہگاروں کے لئے پناہ گاہ قرار دیا اور وعدہ فرمایا کہ،

وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا

جو شخص اس گھر میں داخل ہوگا وہ ہرگز نڈر محفوظ ہے۔

اس لئے کوئی گنہگار اس در سے مایوس کیسے لوٹ سکتا ہے۔ اس سے دل کو ڈھارس بندھتی ہے اور وہ زبان حال سے یہ اشعار،

بر درآمد بندۂ بگریختہ آبروئے خود ز عصیاں ریختہ
اے لطف تو دستگیر ہر خودرائے دے عفو تو پردہ پوش ہر رسوائے
بخشائے براں کسے کہ اندر ہمہ عمر جز درگہ تو ہیچ ندارد جائے
اے بدر ماندگی پناہ ہمہ کرم تست عذر خواہ ہمہ
خسر واز تو پناہ می جوید اے پناہ من و پناہ ہمہ

پڑھتا ہوا آگے بڑھتا ہے، اس التجا و زاری کو سنکر خود رحمت الٰہی دستگیری کرتی ہے۔ مغفرت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، اور خانۂ کعبہ کے والہانہ طواف، ملتزم شریف پر دل کی بیقراری، آنکھوں کی گریہ وزاری باب کعبہ پر جبیں سائی سے دل کی کیفیت بدلنے لگتی ہے، مایوسی کے تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں، رحمت و مغفرت کے دروازے کھلنے لگتے ہیں اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس در سے کبھی کوئی بھکاری نامراد نہیں لوٹتا، اور مغفرت کا یقین لیکر مطمئن و مسرور لوٹتا ہے۔

اور یہ شاعری حق الیقین بن جاتی ہے۔

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

خانۂ کعبہ کے گرد عجیب کیفیت ہوتی ہے، کوئی ملتزم شریف سے چمٹا ہوا رو رہا ہے، کوئی چوکھٹ کو پکڑے بلبلا رہا ہے، کوئی کعبہ کے در و دیوار پر سر رگڑ رگڑ کر آنسو بہا رہا ہے، کوئی غلافِ کعبہ کو آنکھوں سے مل رہا ہے، ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہے، ان میں سے ہر جگہ توبہ قبول ہوتی ہے، مغفرت کے پروانے ملتے ہیں گناہوں کی بخشش ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رحمت و مغفرت کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، اور گنہگار اس میں نہا کر اپنے گناہوں کو دھو رہے ہیں، یہ شاعری نہیں بلکہ حقیقت ہے، صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ حج مبرور کے بعد سارے گناہ دُھل جاتے ہیں بشرطیکہ توبہ توبۃ النصوح ہو اور آئندہ زندگی بدل جائے، یہ نہیں کہ حج کے ذریعہ پرانا حساب کتاب بے باق کر کے نیا کھاتہ کھولدیا۔ حج مبرور کی علامت یہ ہے کہ پھر حتی الامکان بداعمالیوں سے دامن بچا رہے۔

طواف کا منظر: طواف کعبہ کا منظر بھی عجیب ہوتا ہے، رات دن ہزاروں لاکھوں انسان دیوانہ وار اسکا چکر لگاتے رہتے ہیں، زبان مصروف دعا ہے اور قدم کعبہ کے گرد رواں دواں۔ ان میں سلاطین و امرا بھی ہوتے ہیں اور گدائے بے نوا بھی، صلحاء و اخیار بھی ہوتے ہیں اور طالب مغفرت فساق و فجار بھی، بڑے بڑے علماء اور اہل علم بھی ہوتے ہیں اور ناخواندہ جاہل بھی، عورتیں بھی ہوتی ہیں مرد بھی، بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جوان بھی اور حج کے ایام میں ان کا لباس بھی عاشقانہ ہوتا ہے، جسم پر ایک بے سلی تہمد ہوتی ہے اور کندھوں پر بے سلی چادر، اس لباس میں ایک خاص کیفیت ہوتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

خانۂ کعبہ میں اسلام کی عالمگیریت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، جہاں مختلف ملکوں، مختلف قوموں مختلف نسلوں، مختلف رنگ و روپ، مختلف زبانوں اور مختلف وضع قطع کے لوگ، ایک لباس، ایک رنگ اور ایک کیفیت میں سرشار نظر آتے ہیں، جس کی نظیر دنیا کے کسی خطہ میں نہیں مل سکتی۔ اسی سلسلہ میں ایک بات جو اب تک دل میں کھٹک رہی ہے لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، عورتوں اور مردوں کے مخلوط طواف کی روایت اگرچہ ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے لیکن اس زمانہ کے . .

وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا

. . . . . لحاظ سے قابل اصلاح ہے۔ مردوں اور عورتوں کی ریل پیل ایسی ایک ساتھ ہوتی ہے کہ عورتوں کے ہجوم سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر ان دونوں کے طواف کے اوقات الگ الگ کر دئے جائیں یا مطاف میں دونوں کے طواف کا دائرہ الگ کر دیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں حجر اسود کے بوسہ کا مسئلہ اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ باری باری سے دونوں دائروں پر مرد اور عورتیں طواف کریں اس طرح دونوں کو حجر اسود کے بوسہ کا موقع مل جائے گا، حجر اسود کے بوسہ کے لئے اتنا ہجوم اور اتنی کشمکش ہوتی ہے کہ ایک دوسرے پر پلا پڑتا ہے جو شرعی حکم کے سراسر خلاف ہے ایسی صورت میں استلام پر اکتفا کرنا چاہئے، راقم بیشتر اسی پر عمل کرتا تھا، مگر الحمدللہ اس احتیاط کے باوجود کئی مرتبہ بوسہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

زمزم: زمزم کا کنواں ایک زندہ معجزہ ہے، یہ متوسط حجم کا کنواں ہے، حج کے زمانہ میں لاکھوں انسان اس کا پانی پیتے ہیں، نماز کے اوقات میں اس سے وضو کرتے ہیں، بعض نہاتے بھی ہیں یا کم از کم تبرکاً اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں، ہر حاجی آب زمزم کے کنستر بھروا کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس کے باوجود پانی میں کمی نہیں آتی حالانکہ پانی کے اتنے صرف کے لئے بڑے بڑے انہار اور باولیاں بھی ناکافی ہیں۔

زمزم کے پانی کی حدیثوں میں بڑی فضیلت آئی ہے، اس کو امراض کے لئے شفا قرار دیا گیا ہے، واقعات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، خود مدحت صاحب کامل قدوائی نے جو نئے زمانہ کے تعلیم یافتہ روشن خیال آدمی ہیں اس قسم کے کئی چشم دید واقعات مجھ سے بیان کئے، جن کو سنکر حیرت ہوئی، کیمیاوی تحلیل سے بھی اسکی تصدیق ہو چکی ہے کہ زمزم کے پانی میں بہت سے شفابخش اجزا ہیں۔

منیٰ، عرفات اور مزدلفہ: خانۂ کعبہ کے بعد منیٰ، عرفات اور مزدلفہ انوار الٰہی کا مہبط اور دعا و مناجات کے خاص مقامات ہیں، اس لئے خانۂ کعبہ کے طواف اور صفا و مروہ کی سعی کے بعد حج کے دوسرے مناسک انہی تینوں مقامات میں ادا کئے جاتے ہیں، ان کا قیام وقوف، رمی جمار، قربانی حلق راس اور عبادت و ریاضت وغیرہ ارکانِ حج میں ہیں، عرفات کا وقوف سب سے بڑا رکن ہے، اس کے بغیر حج نہیں ہوتا، ۸ ذی الحجہ سے لیکر ۱۲ تک ان مقامات میں مسلسل کوچ و قیام کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس شعر کی تصویر نگاہ کے سامنے آ جاتی ہے۔

طلب تمام ہو مطلوب کی اگر حد ہو لگا ہوا ہے یہاں کوچ ہر مقام کے بعد

یہ تینوں مقامات مکہ معظمہ سے ۵-۶ میل سے لے کر ۱۰-۱۲ میل کے حلقہ میں ہیں، پہلے یہ سب کھلے میدان تھے اب منیٰ میں بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں، مگر اس کا بڑا حصہ میدان ہی ہے، جہاں حج کے ایام میں خیموں کا پورا شہر آباد ہو جاتا ہے۔

مسجد نبویؐ اور بارگاہ نبویؐ کے اثرات و کوائف: مسجد نبویؐ خانۂ کعبہ کے بعد دنیا کی ساری مسجدوں سے اور روضۂ پاک کی سرزمین ساری دنیا سے افضل ہے، یہ وہ بارگاہ قدس ہے جہاں قدم رکھتے ہوئے بڑے بڑے صلحاء و اخیار امت کے حواس گم ہو جاتے ہیں ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

جب ان نفوس قدسیہ کا یہ حال ہے تو گنہگار کس شمار میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو سمیع و بصیر ہے، ہر جگہ موجود ہے، اس کے لئے غیب و شہود برابر ہے، اس پر کسی بندہ کا حال خواہ وہ کہیں بھی ہو پوشیدہ نہیں ہے، لیکن خانہ کعبہ اس کی خاص جلوہ گاہ ہے، اس لئے یہاں گناہوں کا احساس ہونا تعجب انگیز نہیں، مگر حضور کی آنکھوں سے امت کے اعمال پوشیدہ ہیں، اور یہ بھی یقین ہے کہ آپ قبر انور میں حواس باطنی کے ساتھ تشریف فرما ہیں، لوگوں کی حاضری کو محسوس فرماتے صلوٰۃ و سلام سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں، اس لئے آستان پاک پر حاضری کے وقت اس خوف سے کہ آپ پر ساری بداعمالیاں منکشف ہو جائیں گی اور آپ کے سامنے پہلی مرتبہ رسوائی ہوگی، گناہوں کا احساس اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جس سے بچنے کے لئے اقبال نے بارگاہ خداوندی میں التجا کی ہے،

تو شہنشاہ دو عالم من فقیر روز محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اس خوف سے آلودۂ عصیاں قدم آگے نہیں بڑھتے، دوسری طرف روضۂ پاک کی کشش اور حضوری کی تمنا اپنی طرف کھینچتی ہے اور کشمکش کی عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، مگر حضورؐ کی ذات پاک سراسر رحمت ہے، دعا ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کے جلوے آج بھی حرم شریف میں اتنے نمایاں ہیں کہ چشم ظاہر سے ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، یہ رحمت خود بڑھ کر دستگیری کرتی ہے، شفاعت کی حدیثیں تسلی دیتی ہیں کہ بڑے سے بڑا گنہگار آپ کی مقبول شفاعت سے محروم نہ رہے گا۔

من زار قبری وجبت له شفاعتی جس نے میری قبر کی زیارت کی اسکے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

شفاعتی لاهل الکبائر میری شفاعت بڑے گنہگاروں کے لئے ہے۔

شفاعتی لاهل الذنوب من امتی وان زنا وان سرق میری شفاعت گناہگاروں کے لئے ہے خواہ انہوں نے زنا اور چوری جیسے گناہ کبیرہ کیے ہوں۔

زسرتا پا رحمتی یا محمد نظر جانب ہر گنہگار داری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا۔ (نساء ۔ ۹)

اور وہ لوگ جنھوں نے (گناہ کر کے) اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہو تے پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت والا پاتے۔

گنہگاران امت اسی توبہ و استغفار کے لئے آستان نبوی پر حاضر ہوتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ضرور پورا ہوگا، اس سے دل کو ڈھارس بندھتی ہے، رُکے ہوئے قدم آگے بڑھنے لگتے ہیں، مواجہہ شریف میں پہنچکر پھر متضاد کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، ایک طرف جالیوں کی طرف نظر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی،

کس آنکھ سے دیکھیں انھیں ہمت نہیں پڑتی وہ مصحف رخ پاک ہے آلودہ نظر ہم
غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

دوسری طرف دل چاہتا ہے کہ بس ٹکٹکی باندھے دیکھا کیجئے، پلک جھپکانا بھی گراں گزرتا ہے،

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

اس کشمکش میں کبھی نظر اٹھتی ہے کبھی جھپکتی ہے لیکن صلوٰۃ و سلام پیش کرنے کے بعد یہ کیفیت دور ہو جاتی ہے اور ایسا سکون ہو جاتا ہے جیسے شیر خوار بچہ اپنی ماں کی آغوش شفقت میں پہنچ گیا

تہجد کی نماز سے لے کر عشاء بعد تک صلوٰۃ و سلام پیش کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے خصوصاً پانچوں نمازوں کے بعد اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ کھڑے ہونے کی جگہ ملنا مشکل ہو جاتا ہے، ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق صلوٰۃ و سلام پیش کرتا ہے، اور وجد و بیخودی کا عجیب عالم نظر آتا ہے، اس بیخودی میں ناواقف لوگ حد ادب کا بھی لحاظ نہیں رکھتے، جہاں بلند آواز سے بولنا اور روضۂ مبارک کے قریب جانا حد ادب کے خلاف ہے، کشمکش سے باز نہیں آتے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ جالی مبارک کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو یہ بھی محبت اور وفور شوق ہی کا مظہر ہے لیکن خلاف ادب ہے۔

یوں تو بہت سے صلوٰۃ و سلام ہیں جن کو پڑھنے والے اپنے ذوق کے مطابق پڑھتے ہیں لیکن ہم ہندوستانیوں کو اصل لطف اردو اور فارسی کے صلوٰۃ و سلام میں آتا ہے، اس لئے عربی کے صلوٰۃ و سلام کے بعد اس کو ضرور پڑھنا چاہئے اور لوگ پڑھتے بھی ہیں۔ راقم عربی کے صلوٰۃ و سلام کے بعد ملا واعظ کاشفی کا یہ کلام

بسلام آمدم بجوابم دہ مرہم بردلِ فگارم نہ
بس بود جاہ و احترام مرا یک علیک از تو صد سلام مرا
خواہم از شوق پائے بوس تو کرد پائے بیروں کن از زیانی برد
سوئم افگن ز رحمت نظرے باز کن بر رخم بہ لطف درے
زاری من شنو تکلم کن گریۂ من نگر تبسم کن
لب بہ جنباں پئے شفاعت من منگر بر گناہ و طاعت من
گرنہ رفتم طریق سنت تو ہستم از عاصیانِ امت تو
رحم کن بر من و فقیری من دست دہ بہر دستگیری من

اور خواجہ فریدالدین عطار کی نعت۔

یا رسول اللہ بے درماندہ ام
باد بر کف خاک بر سر ماندہ ام
بیکساں را کس توئی در ہر نفس
من ندارم در دو عالم جز تو کس
یک نظر سوئے من غمخوارہ کن
چارۂ کارِ من بیچارہ کن
اے شفاعت خواہ مشتے تیرہ روز
لطف کن شمع شفاعت بر فروز
تا چو پروانہ میان جمع تو
پر زناں آیم بہ پیش شمع تو

اور اس قبیل کے دوسرے اشعار پڑھا کرتا تھا۔

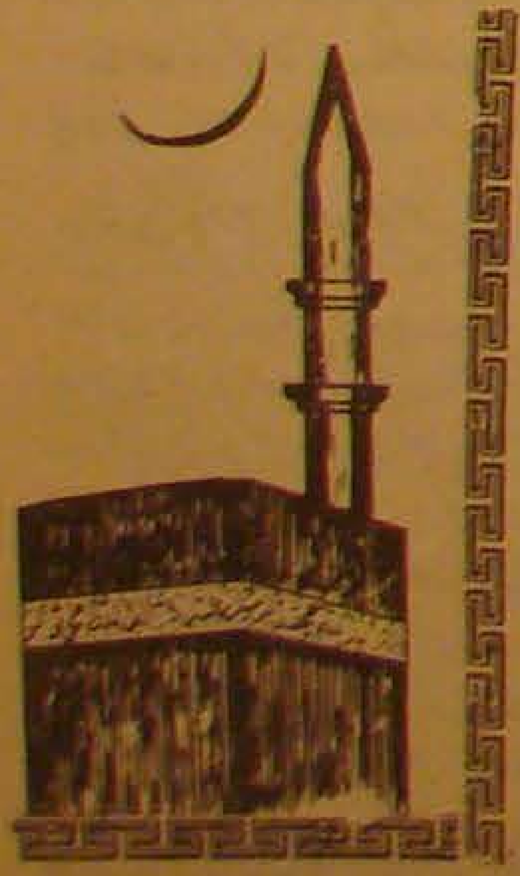

جس شاخ پر ہم نے نشیمن بنایا ہے آج ہم اسی پر آری چلا رہے ہیں

سیاسی پارٹیوں کے سامنے صرف ایک حقیقت رہ گئی ہے کہ الیکشن کس طرح جیتا جائے۔

الٰہ آباد کے ایک مخلوط اجتماع میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "موجودہ حالات میں ہماری سوسائٹی کیا رول ادا کر سکتی ہے" اس موضوع پر تقریر فرمائی۔ جلسے میں ہزاروں کی تعداد میں مسلم اور غیر مسلم تعلیمیافتہ طبقہ کے افراد شریک تھے پوری تقریر صبر و سکون سے سنی گئی اور اُسے ہر ایک نے اپنے دل کی آواز سمجھا۔ افادۂ عام کی غرض سے یہ تقریر ٹیپ ریکارڈ سے قلمبند کر کے شائع کی جا رہی ہے۔

(مرتب: سعید احمد الٰہ آبادی)

بعض اوقات برسوں بعد ایسا آتا ہے کہ انسان کسی شدید بیماری سے دوچار ہوتا ہے، یوں تو انسان بیمار ہو کر، اچھا ہو کر، بھوکا ہو کر، بھوک کا اظہار کر کے کھانے کا محتاج بن کر اپنی انسانیت کا اظہار کرتا ہے، اور اپنی انسانیت کا ثبوت دیتا ہے لیکن جس کو بحرانی کیفیت کہتے ہیں، ہسٹریا کا حملہ کہتے ہیں اور پوری انسانی سوسائٹی جس کا شکار ہو وہ کبھی صدیوں کے بعد ہوا کرتا، بعض مخصوص اسباب کی بنا پر کچھ عوامل ایسے ہوتے ہیں جو اپنا کام کرتے رہتے ہیں اس وقت لوگوں کو خیال نہیں ہوتا کہ وہ کیا عمل کر رہے ہیں ان کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے بہت سے لوگ ان پر نوٹس لینے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں لیکن یہ عوامل، یہ Factors اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور پھر وہ کام کرتے کرتے جس طریقہ سے ہر چیز کی ایک ترقی کی منزل ہوتی ہے وہ ایسی Developed ہوتی ہے کہ اس کا حملہ ہسٹریا کی طرح ہوتا ہے اور وہ اچانک ہی ہوتا ہے اور بہت شدید ہوتا ہے۔ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ یہ مصیبت کہاں سے آ گئی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا ہے اس کا مادہ جو کئی دنوں سے تیار ہو رہا تھا انسان کا جسم اس کی موافقت کرنے سے اس کو Reject کرنے سے، اسکا مقابلہ کرنے سے ہار گیا تھا اس کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا، یہاں تک کہ اس بیماری کا پوری طرح قبضہ ہو گیا۔

حالات غیر معتدل اور غیر معمولی: تو اس وقت جو حالات ہمارے ملک اور پوری دنیا میں رونما ہیں وہ غیر معتدل اور غیر معمولی ہیں لیکن یہ ماننے کے لئے میں تیار نہیں اور آپ میں سے بھی حضرات تعلیمیافتہ ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ حالات اچانک ایکسیڈنٹ کی طرح رونما نہیں ہوئے بلکہ یہ ارتقاء کا Evolution کا نتیجہ ہیں جو سیکڑوں برس سے کام کر رہا تھا۔ ان بیماریوں کی رفتار کم و بیش ہوتی رہتی ہے بعض مرتبہ موٹر کی رفتار سے تو بعض مرتبہ ایٹمک انرجی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔

اس وقت جو بنیادی حالات ہمارے ملک کو درپیش ہیں یہ اچانک نہیں پیدا ہو گئے، آپکو شاید تعجب ہو یا آپ اسے خلاف توقع بات سمجھ رہے ہوں لیکن میں اس پر کسی حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کرتا ——— مجھے ان حالات سے بالکل تعجب نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ میں ان حالات سے مایوس بھی نہیں اور مجھے ان سے زیادہ تکلیف بھی نہیں۔ یہ حالات تو میرے نزدیک زندگی کی علامت ہیں، یہ حالات تو پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری تاریخ کا جتنا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے، یہ خود بتاتا ہے کہ انسان فرشتوں کی طرح یا بے نفس انسانوں کی طرح جس کے اندر شر کی صلاحیت ہی نہ ہو بلکہ وہ خیر مجسم بن گیا ہو اس کے اندر سوائے خیر خواہی اور خیر طلبی کے کوئی صلاحیت ہی نہ رہی ہو تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں گذرا۔ اگر گذرا بھی ہے تو وہ کسی پیغمبر کی کوشش، کسی بڑے مصلح کے تگ و دو سے۔ لیکن اس کا رقبہ بھی محدود تھا اس کا زمانہ بھی محدود تھا۔ یہ نہیں رہا کہ صدیوں تک یہ صورت حال قائم رہی ہو، اور ساری دنیا پر پورے کرۂ ارض پر اس کا اثر ہو۔ ایسا نہیں ہوا۔ عموماً ہر زمانے میں اکثریت متوسط درجے کے لوگوں کی رہی ہے Genius قسم کے لوگ ہر دور میں بہت کم ہوتے ہیں اور اور اس زمانہ میں بھی کم ہیں۔

ہمارے ملک میں جو اس وقت انتشار ہے دولت پیدا کرنے کا بحران ہے۔ اس وقت جو خود غرضی ہمارے اوپر چھائی ہوئی ہے۔ اس وقت جو دولت کی پیاس اور بھوک اس قدر بڑھ گئی ہے کہ آدمی دیوانہ ہو گیا ہے اس وقت جو کرپشن پھیلا ہوا ہے، اس وقت ذخیرہ اندوزی کا جو دور دورہ ہے، اس وقت نفسی نفسی کا جو دور دورہ ہے، فرض شناسی کا فقدان ہے، اس وقت دیانت و امانت کا فقدان ہے ادائے فرض کا کوئی احساس نہیں۔ مجھے اس پر زیادہ دکھ بھی نہیں ہے میں اس صورت حال سے بالکل مایوس نہیں ہوں۔

میں پھر عرض کروں گا کہ میری ہر بات آپ لوگوں کے لئے بالکل خلاف توقع ہو گی میں گویا جان بوجھ کر اپنے کاز کو نقصان پہونچا رہا ہوں۔ میں گویا وکیل حریف کے سارے دلائل بیان کر رہا ہوں۔ آپ کے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے نامور جج جسٹس محمود کے متعلق

میں نے سنا ہے کہ انہوں نے ایکمرتبہ اپنی ذہانت کے جوش میں اپنے موکل کے خلاف تمام دلائل دینے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد انکے کسی جونیر وکیل نے یا رفیق کار نے ان کو متوجہ کیا کہ حضور یہ تو آپ اپنے موکل کے خلاف تمام دلائل جتا رہے ہیں اور اپنے فریق مقابل کو جتا رہے ہیں تو انہوں نے ایکدم سے رخ بدلا (اور) اور کہا کہ میں نے ابھی تک جو دلائل پیش کئے ہیں یہ میرے فریق کے حق میں جو بہتر سے بہتر دلائل دئے جا سکتے تھے وہ یہی دلائل ہیں ان سے بہتر دلائل نہیں دئے جا سکتے اب میں انکا توڑ کرتا ہوں، اور انکی تردید کرتا ہوں اور فوراً عدالت کا رنگ بدل گیا اور رخ دوسری طرف ہو گیا، تو آپ تھوڑی دیر کے لئے یہ محسوس کرنے لگیں کہ میں اپنے مقدمے کو ہرا رہا ہوں کیونکہ میں یہاں یہ کہنے آیا تھا کہ حالات نہایت نازک ہیں، نہایت خراب ہیں اس میں ہمارا معاشرہ، ہمارا سماج، ہماری سوسائٹی کیا رول ادا کر سکتی ہے، کس طرح اسے روک سکتی ہے، یہ جو ہماری طرف ایک لاوا ایک خوفناک طوفان بڑھ رہا ہے اس کو ہم کس طرح روک سکتے ہیں۔ لیکن میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہے اور اس صورت حال پر زیادہ دکھ بھی نہیں ہے، مایوس بھی نہیں ہوں، تو یہ بالکل توقع کے خلاف ہے اور یہ تو اپنے موضوع و مقصد سے ایک طرح کی بیوفائی ہے۔

لیکن حضرات نہ تو میں اپنے ساتھ بے وفائی کر رہا ہوں اور نہ اپنے موضوع کے ساتھ۔ مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ سب تو زندگی کی علامت ہے، انسان، انسان ہے، انسان سے یہ توقع کرنا کہ وہ فرشتہ بن جائے، اس کے اندر دولت کی قدر نہ ہو، اسکے اندر آسائش کے ساتھ زندگی گذارنے کی خواہش نہ ہو، یہ تو گویا انسان کی زندگی کو ختم کر دینا ہے، اور انسان کا گلا گھونٹ دینا ہے، انسان کی امنگوں کا، اسکی صلاحیتوں اور اسکی حوصلہ مندیوں کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ اگر انسان کو مہذب، آرام دہ اور منظم زندگی گذارنے کا شوق ہے تو اس شوق پر تعجب نہ کرنا چاہیئے اور نہ پیشانی پر شکن آنی چاہیئے اور نہ لبوں پر تبسم آنا چاہیئے اور نہ حقارت و نفرت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔ اور نہ کوئی احتجاج کرنا چاہیئے۔ میں تو ایک قدم آگے بڑھ کر کہونگا کہ اس پر مبارکباد دینا چاہیئے، کہ انسان زندہ ہے، انسان

ذہانت رکھتا ہے، اسکے اندر انسانی احساسات ہر طرح بیدار ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اس پر تعجب نہیں ہے لیکن مجھے اس وقت پوری دنیا سے بحث نہیں ہے دنیا کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہمارا اور آپ کا وقت بہت محدود، ہماری قسمت ہمارے ملک سے وابستہ ہے، ہمکو یہیں جینا اور مرنا ہے، ہم اتنی بڑی دنیا کو سنبھال بھی نہیں سکتے شاید اسکا ہم سے مطالبہ بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت سے، پیغمبر کے جانشینوں کی حیثیت سے اور ایک دردمند انسان کی حیثیت سے ہمارا تعلق پوری دنیا سے پوری انسانیت سے ہے۔ لیکن میں اس وقت اپنے موضوع کو وسیع کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اپنے دائرہ کو تنگ رکھنا چاہتا ہوں۔

خاص عوامل اور انکے ارتقاء کا نتیجہ: تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حالات حاضرہ سے نہ میں بددل ہوں نہ مایوس، یہ جو کچھ ہو رہا ہے طبعی طور پر ہو رہا ہے، خاص عوامل اور انکے ارتقاء کا یہ نتیجہ ہے اور یہی ہونا چاہیئے۔ مجھے تعجب صرف دو چیزوں پر ہے ایک تو یہ کہ یہ چیز حدود کو پھلانگ جائے اور اسمیں اجتماعی مفاد اس طرح پس پشت ڈالدیا جائے کہ گویا اسکی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے یعنی دولت مند بننا، یہ جذبہ کوئی بری چیز نہیں ہے یہ ہمیشہ رہا ہے دنیا کی ترقی اور چہل پہل اسی جذبہ کی رہین منت ہے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ جذبہ انسانوں میں نہ ہوتا تو تمدن اور سائنس اتنی ترقی نہ کرتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارا ادب، ہماری شاعری ترقی نہ کرتی، اس لئے کہ ہمارے ادب و شاعری کو بھی اسی سے غذا ملتی ہے۔

انسان کے اندر بڑا بننے کا جذبہ فطری ہے، اسکے اندر مسابقت کا جذبہ طبعی طور پر ہے وہ ایکدوسرے سے سبقت لیجانا چاہتا ہے، اسکے اندر احساس جمال ہے، اسکے اندر حسن کا احساس ہے، اسکے اندر کمال کی قدر ہے، علم و ادب، شاعری و فلسفہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

دو چیزیں قابل شکایت اور قابل فکر: البتہ دو چیزیں قابل شکایت بھی ہیں اور قابل فکر بھی۔ اسکی وجہ سے اگر ہمارے اور آپکے اندر فکر پیدا ہو، ہماری اور آپکی نیند پر اس سے اثر پڑے، ہمارا اور آپ کا سکون اس سے متاثر ہو تو وہ بالکل بجا ہے اور حق بجانب ہے۔

ایک تو یہ کہ انسان کی یہ خواہش اندھی اور بہری ہو جائے اور وہ ان خواہشات کے پیچھے مجنوں اور دیوانہ اور مدہوش ہو جائے۔ کہ وہ ہر قیمت پر دولتمند بننا چاہے، ہر قیمت پر آسائش کی زندگی گذارنا چاہے، ہر قیمت پر سرمایہ دار ہونا چاہئے اور وہ یہ چاہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت اسکے پاس جمع ہو جائے، ایک رات میں لکھ پتی، کروڑ پتی بن جائے۔

آپ اگر دنیا کی اخلاقی تاریخ کا مطالعہ کریں، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ایسی کوئی تاریخ لکھی ہی نہیں گئی جس میں دنیا کی ترقی کو اور اس پر جو واقعات پیش آئے ہیں اور انسانوں میں جو رجحانات کام کرتے ہیں انکو اخلاقی پیمانے سے ناپا گیا ہو، کوئی ایسا اخلاقی تھرمامیٹر نہیں رہا۔ لیکن اگر آپ خود دنیا کی اخلاقی تاریخ کا کوشش اور ذہانت سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا کو اس جذبے سے اتنا نقصان نہیں پہونچا، حق حاصل کرنے کے جذبے دولت حاصل کرنے کے جذبے نے انسانیت کو کبھی کوئی بہت بڑا نقصان نہیں پہونچایا۔ یہ چیزیں تو اوسط درجہ کے لوگوں میں ہمیشہ رہی ہیں۔ بلکہ بہت سے نیک انسانوں میں بھی رہی ہیں، پیغمبروں کی تربیت کی ہوئی جماعت میں بھی رہی ہے لیکن نقصان جس چیز سے پہونچا وہ اندھا دھند دولت کی خواہش اور کم سے کم وقت میں آنکھ بند کر کے سرمایہ دار بن جانے کا یہ جذبہ بڑا مضر ہے۔ یہ تباہ کن و مہلک جذبہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں جو بڑی جنگیں ہوئی ہیں، دنیا میں جو تباہی و بربادی پھیلی۔ وہ ان لوگوں کے ہاتھوں نہیں ہوئیں جنکے اندر متوسط درجہ کا دولت مند بننا، آسائش کے ساتھ زندگی گذارنا اور اپنی جو ضروریات مہیا کرنے کا جذبہ تھا۔

دنیا کی تباہی ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہوئی جو اپنی خواہشات کے پیچھے اندھے اور بہرے ہو کر پڑ گئے، یہ خونی لکیریں جو آپ کو تاریخ کی پیشانی پر نظر آتی ہیں، تاریخ کے اندر جو ایک دور کو دوسرے دور سے ممتاز کرتی ہیں، اور جو ملک کو ملک سے، قوم کو قوم سے، ایک ریاست کو دوسری ریاست سے، برادری کو برادری سے، ایک فرقے کو دوسرے فرقہ سے اور ایک فرقے کے مختلف اجزاء کو ایکدوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور یہ خونی لکیریں انسانوں کے گرم، تازہ اور گاڑھے خون سے کھینچی ہوئی ہیں یہ لکیریں ان لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں جنکے اندر یہ جذبہ جنون کی حد تک پہونچ گیا تھا اور جنھوں نے تمام انسانی مفادات، اجتماعی مصلحتوں، انسان کے مستقبل کو، انسان کے حق کو سب کو چیلنج کیا تھا، ان سے انکار کیا تھا اور انکو ٹھکرا دیا تھا۔ سب کو پامال کر دیا تھا سب کا گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی تھی، یہ جو بڑے بڑے کشور کشا، بڑے بڑے فاتح آپ کو نظر آتے ہیں وہ اسلئے نہیں ہوئے تھے کہ بقدر ضرورت دولت حاصل کریں، بقدر ضرورت طاقت حاصل کریں، بقدر ضرورت اپنے ملکوں کو عزت دیں، بقدر ضرورت اپنے ملکوں کی حفاظت کریں، بقدر ضرورت اپنے ملکوں سے غیر ملکی اقتدار ختم کریں۔ غیر ملکی غاصبوں کو اپنے ملک کی سرزمین سے نکالیں، یہ تو بہت پاک مقصد تھا۔ اس زمانے کے دیندار، اس زمانے کے فلسفی اور دانشور اسکی تعریف کرتے، کون اس سے انکار کر سکتا تھا، ہمارے ملک پر انگریز قابض تھے ان کو اس ملک پر قبضہ کرنے کا کیا حق تھا، جو لوگ اس کے خلاف برسر پیکار ہوئے وہ ایک نہایت مقدس فرض کو ادا کرنے کے لئے اٹھے تھے ہر شخص نے انکی پیٹھ ٹھونکی، انکو شاباشی دی۔ وہ کونسا نامراد، کونسا وطن دشمن، کونسا بدنصیب تھا جس نے اس کی مخالفت کی، یہ جذبہ تو ہر زمانہ میں نہایت پاکیزہ، نہایت مقدس، قابل احترام اور ہر طرح سے قابل داد تھا۔ اس سے نہ کبھی نقصان پہنچا ہے اور نہ پہنچ سکتا ہے، میں ایک طالبعلم کی حیثیت سے چیلنج کرتا ہوں اور دعوی کرتا ہوں کہ آپ دکھا دیں کہ کبھی کسی ملک کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے جو بھی کوشش کی گئیں ان سے کسی تحریک کو نقصان پہنچا ہو اور کسی تمدن کو کوئی نقصان پہنچا ہو، لیکن یہی کوشش جب حدود کو پھلانگ جاتی ہیں اور وہ خونریزی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ہسٹریا کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو پھر دنیا میں وہ تباہی و بربادی نازل ہوتی ہے جسکے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یہ تباہی اتنی ہی زیادہ عام ہوتی ہے جتنے وسائل اس تحریک کے علمبردار کے پاس ہوتے ہیں۔ — علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک

جب یہ خونی سیلاب آتا ہے تو تمام تہذیبیں، ہر قسم کا تمدن، ہزاروں برس کے جمع کئے ہوئے خزانے، ہزاروں برس کی جمع کی ہوئی کتابیں جنکے لئے دانشوروں نے اپنی آنکھیں پھوڑی تھیں، راتوں کو جاگ کر محنتیں کی تھیں، شاعروں کے ضخیم ضخیم دیوان جنکو انہوں نے اپنے خون جگر سے مرتب کیا تھا اور جو انسانی ذہانت کے عمدہ نمونے تھے، دم کے دم میں بالکل خاک سیاہ ہو جاتی ہیں۔ اور پورا شہر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات پورا ملک ملبے میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس لئے مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے، اور میں اپنے بھائیوں سے اس بنا پر مایوس ہوں کہ وہ کامیاب زندگی گذارنے کی خواہش کر رہے ہیں۔

اجتماعی مفاد نظر انداز: لیکن مجھے افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی مفادات کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ اور اجتماعی مفادات کے ملبے اور قبر پر اپنے ذاتی اغراض کی نئی عمارت تعمیر کریں، جب کسی شہر یا کسی سماج یا سوسائٹی میں یہ مرض پیدا ہو جائے یعنی انکے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ انسانوں کی لاشوں پر گدہ کر ہم کو آرام حاصل کرنا ہے، ہمیں عام انسانوں کے جذبات کو کچلتے ہوئے، انکے جائز مطالبات کو ٹھکراتے ہوئے انکی زندگی کے تقاضوں کا انکار کرتے ہوئے، انکے بچوں کو یتیم بناتے ہوئے اور انکی عورتوں کو سوگوار اور بے یار و مددگار کرتے ہوئے اپنی ضروریات مہیا کرنی اور اپنی خواہشات کو پورا کرنی ہے — تو یہ جذبہ خطرناک ہے۔ جب کسی سوسائٹی میں یہ زہر پیدا ہو جائے تو وہ سوسائٹی، وہ جماعت زیادہ دن دنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہ جاتی، بلکہ یہ جذبہ پوری قوم، پوری انسانیت کو ہلاک و برباد کر ڈالتا ہے۔

سوسائٹی ہمیشہ ان لوگوں کے پاؤں کے نیچے کچلی گئی ہے روندی گئی ہے جو بالکل مست ہاتھی کی طرح رہتے تھے جنکا نصب العین یہ تھا کہ ہمیں تو دولت حاصل کرنی ہے، ہمیں تو عزت پیدا کرنی ہے ہمیں تو وزارت حاصل کرنی ہے، خواہ اسکی قیمت کچھ بھی ہو، ہر قیمت پر اسکو حاصل کرنا ہے، اسلئے وہ اپنے گاؤں، شہر، قصبہ بلکہ اپنی پوری سوسائٹی و جماعت کو داؤ پر لگا دیتے ہیں اور تمام انسانوں کو اپنی مقصد کے حصول کے لئے قربانگاہ پر چڑھا دیتے ہیں۔

یہی مرض پیدا ہو گیا ہے: یہی مرض کچھ دنوں سے ہمارے اندر بھی پیدا ہو گیا ہے۔ یہ مرض بڑا مہلک و خطرناک ہے اور جو کچھ آپ اسوقت دیکھ رہے ہیں، عام زندگی میں جو ناہمواری اور بے اعتدالی ہے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں مل رہا ہے ہمیں اس پر یقیناً اتنا افسوس نہ ہوتا اگر یہ ملک زراعتی ملک نہ ہوتا ہمیں غلہ نہ ملنے پر اتنا افسوس نہ ہوتا، اگر ہمارے اس ملک کے وسائل محدود ہوتے، یہاں کھیتی نہ ہوتی، اتنا بڑا ملک ہمکو نہ ملا ہوتا، آبادی بہت لیکن ملک چھوٹا سا ہوتا، اگر ہمارے ملک میں قدرت کی عطیات اور اللہ کی نعمتیں نہ آتیں جیسا کہ یورپ کے بہت سے ملک ہیں، وہاں سب کچھ ہے مگر پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ آپ وسط یورپ جائیے، آپ کو وہاں ایسے چھوٹے چھوٹے ملک ملیں گے کہ جنکے یہاں وسائل کی بہت کمی ہے، لیکن اسکے باوجود وہاں یہ بے چینی و قلق نظر نہیں آتا ہے۔

آپ ہی بتائیے آپ میں سے یہاں بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں کہ ہمارا ملک مفلس ملک نہیں ہے؟ کیا یہاں وسائل زندگی کی کمی ہے؟ کیا یہاں دریاؤں کی کمی ہے؟ کیا یہ ایک بنجر اور چھوٹا سا ملک ہے؟ ہمارے ملک میں کسی چیز کی کمی ہے، خدا کی قدرت، خدا کی سخاوت نے اس ملک کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی ہے بلکہ واقعہ ہے کہ اس ملک کو قدرتی خزانوں سے مالا مال کر دیا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ اس ملک کی ابتری، غذائی اشیاء اور دوسری ضروریات زندگی کی کمی کی وجہ سے ہے تو میں انکو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس ملک سے واقف نہیں ہیں انکو اپنے ملک کی قدر نہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کو دیکھا نہیں ہے میں نے اس ملک کو خوب دیکھا ہے شاید اس مجمع میں کم ہی آدمی ہونگے جنھوں نے میری طرح اس ملک کی سیاحت کی ہے میں نے مختلف اسباب کی بنا پر اس ملک کو چھان ڈالا ہے مجھے سیر و سیاحت کا شوق بھی ہے اور اسکے مواقع بھی ملتے رہے ہیں، اور بعض وفود کے ساتھ بھی دورہ کرنا پڑا تو حیران رہ گیا کہ اللہ اکبر کتنا لق و دق ملک خدا نے ہمکو عطا کیا ہے — یورپ میں مجھے یاد ہے کہ اگر آدمی ذرا سی بے احتیاطی کرے، موٹر ذرا تیز چلائے تو اسکو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے حدود کو چھوڑ کر دوسرے ملک کی سرحد میں داخل نہ ہو جائے۔

جنیوا کا ایک واقعہ: مجھے یاد ہے کہ جنیوا میں ہم لوگ شام کو ہوا خوری کے لئے گئے — ہمارے ساتھ ڈاکٹر حمید اللہ بھی تھے جو ہندوستان کے بہت بڑے اسکالر، وہ حیدرآباد کے رہنے والے تھے، ہندوستان کو تو ان پر فخر ہونا چاہیئے۔ اس وقت وہ مانے ہوئے فرانس کے شہری ہیں) وہ ہمارے ساتھ تھے ایک جگہ جا کر ہم کھڑے ہوئے